دیگر عمدہ مذہبی کتابیں کے۔آر۔ مہرہ۔ بہادرس۔ شاہ عالمی دروازہ لاہور سے طلب کرو۔

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۶۱

RARE BOOK
NOT TO BE ISSUED

مرنیکے بعد کیا ہوگا؟

جسمیں مستند اور درست واقعات سے موت کے سچے اور دلچسپ حالات قلمبند کرے کہ موت کے بعد بھی حیات ابدی کا ہونا لازم و ملزوم ہے

Checked 1987

CHECKED مولفہ CHECKED

خادم الشعراء شیریں سخن۔ اکسیر سیالکوٹی بیرون منڈی لاہور

حسب فرمائش

رفاہ عام کے لئے

حکیم رام کشن تاجر کتب کیسرہ تارکشاں لوہاری گیٹ لاہور

نے

سنہ ۱۹۱۵ء

CHECKED

کوڑیوں کے مول موتی

ہرفن مولا - اس کتاب روپیہ بنانیکی مشین ہرفن مولا کا جسقدر شہرہ ہو رہا ہے۔ کہ اسکا کوئی ہنر ایسا نہیں۔ کہ جس سے انسان اپنی روزی نہ کما سکتا ہو۔ اسمیں مشہور معروف نسخہ امرت دھارا بھی لکھا گیا ہے۔ فہرست ہزاروں ترکیبوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔ بال عمر بھر پیدا نہ ہونیکا مجرب نسخہ۔ بال اڑانیکا اصلی ولایتی صابون۔ بال اڑانیکا پوڈر و عرق۔ ۵ منٹ میں بال سیاہ کرنیکا نسخہ۔ ربڑ کی مہریں۔ کھانے پکانے کی ترکیبیں اچار۔ مربہ۔ چٹنیاں۔ ربڑ کی اشیاء و پریس۔ دیسی و انگریزی صابون۔ موم کی اشیاء۔ موم بتیاں۔ بیسیوں قسم کی سیاہی۔ پریس کے لکھنے کی وغیرہ۔ ریشم و کپڑا رنگنا۔ عطر و روح و لیونڈر۔ خوشبودار تیل۔ اور نقلی جواہرات وغیرہ وغیرہ بنانا۔ غرضیکہ ہزاروں ترکیبیں درج ہیں۔ قیمت اس نادر و لاثانی کتاب کی معہ محصولڈاک۔ (عہ/)

مکمل علاج اسپان بالتصویر - اگر آپ گھوڑوں کی سواری کا مزہ لوٹنا چاہتے ہیں۔ اور اپنے گھر میں گھوڑے رکھنا اعلےٰ شان خیال کرتے ہیں تو ضرور اس نایاب تحفہ کتاب ہذا کو خرید کر اپنے پاس رکھیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے۔ کہ جسکی تعریف میں ہی ایک علیحدہ کتاب بنائی جائے۔ تو ممکن ہے۔ اسمیں معلومات خرید و فروخت اسپان شناخت عمر و تندمزاجی۔ گھوڑے کو چلانا ہدایات متعلقہ شہسواری و علامات صحت و بیماری معہ تشخیص۔ تمام اندرونی۔ بیرونی امراض کے اسباب۔ علامات مشرح طور پر درج ہیں۔ حادثات و صدمات ناگہانی۔ شناخت اور علاج۔ غرضیکہ گھوڑوں کے متعلق تمام امر بالتشریح درج کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا خریدنا گویا ایک چابک اسوار سا سوداگر اسپان کا دماغ خرید لینا ہے۔ کبھی کا بھی محتاج ہونا نہیں پڑتا۔ قیمت۔ (عہ/)

رسالہ علاج چشم - اسمیں آنکھوں کی تمام تشریح معہ کل امراض اور آنکھوں کے بنانے کا حال معہ علاج درج ہے۔ قیمت۔ (۴/)

ہومیوپیتھک طبیب یعنی ہومیوپیتھک کے اکسیر یا ہومیوپیتھک مٹیریا میڈیکا ہر ایک قسم کی بیماری کا علاج بطریق ہومیوپیتھک و ہومیوپیتھک ادویات کی تشریح۔ قیمت [illegible] (عہ/)

علاج مار گزیدہ - سانپوں کی پہچان اور انکا علاج۔ یہ کتاب ایک بنگالی صاحب کی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت۔ (۴/)

ملنے کا پتہ۔ حکیم رام کشن [illegible] کٹڑہ [illegible] - لوہاری گیٹ لاہور

STATE CENTRAL LIBRARY

نذر

میں اپنی یہ چھوٹی اور ناچیز تصنیف

دلی شردھا اور پریم کے ساتھ

اپنے واجب التعظیم بزرگ بھائی

شری یان لالہ وزیر چند صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر

آریہ مسافر کے نام نامی پر سمرپن کرتا ہوں

اکسیر

[سیالکوٹی]

دیباچہ

ناظرین! یہ ایک مشہور بات ہے۔ کہ اجل کے ہاتھوں نجات حاصل کرنا ناممکن بات ہے۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان کی مرنے کے بعد کیا حالت ہوتی ہے ﴿

اس جگہ ہم بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا مطلب ممات فی الجسم سے نہیں ہے۔ کیونکہ جسم انسانی ایک ادنےٰ درجہ کی چیز ہے۔ اور روح کے ساتھ اس کا تعلق ایسا ہے۔ جیسا جسم کے ساتھ لباس کا ﴿

جس طرح کپڑا پھٹ کر۔ خراب ہو کر اور گل سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی جسم بھی جب اس کے اندر سے آتما (روح) نکل جاتی ہے۔ اربعہ عناصر میں مل جاتا ہے ﴿

مگر وہ روح جس کے طفیل اس جسم کی قدر کی جاتی ہے۔ اور صرف جس کی خاطر آپ تکلیف۔ مصائب تک برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ کیا ہوگی؟ ﴿

ہم یہ ماننے کو مطلق تیار نہیں۔ کہ جسمانی اور روحانی موت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور مرنے کے بعد ہر بنی نوع انسان کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ شری کرشن بھگوان ارجن کو گیتا میں اُپدیش کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ روح غیر فانی ہے۔ نہ اسکو آگ جلا سکتی ہے۔ نہ دھوپ خشک کر سکتی ہے۔ جب روح غیر فانی ہوتی۔ تو سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب روح جسمانی موت کے بعد زندہ رہتی ہے۔ تو وہ پھر کہاں جاتی ہے۔ اور کس حالت میں ہوتی ہے۔ ان چند اوراق میں جو ہدیہ ناظرین ہیں۔ یہی نازک مسئلہ زیر بحث ہے تقریباً تمام اہل الرائے یہ رائے قائم کر چکے ہیں۔ کہ اس معمہ کا حل کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے ﴿

مگر یہ خیال زیادہ تر ہماری بے پروائیوں اور تغافل شعاریوں سے پھیلا۔ سچ پوچھو تو سب سے بڑی مشکل جس سے راہ تحقیق مشکل بن گئی ہے۔ اس مسئلہ کا دقیق اور نازک ہونا ہے۔ ایک محقق کو جبکہ وہ اس کے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ اور بجائے تحقیق کے خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں ہستی کو

ہی نہ بھول جائے۔ یہی باعث ہے کہ ہم اس مسئلہ پر غور نہیں کرسکتے ۔
اگر انسان اس مسئلہ پر غور کرے۔ تو اُس کو یہ مسئلہ اتنا مشکل دکھائی نہیں دیگا۔ جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب ہمارے کسی عزیز کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تو اُس وقت ہمکو ضرور اس مضمون پر غور کرنا پڑتا ہے۔ جب ایک عرصہ دراز تک ہم اس مسئلہ پر غور کرتے رہتے ہیں۔ تو بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اُسی وقت ہم سوچتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ جس مسئلہ کو لوگ انسانی طاقت سے باہر خیال کرتے تھے۔ وہ درحقیقت ایسا نہیں ہے ۔

یہ کتاب نہ صرف "موت کے بعد کیا ہوگا" پر لکھی گئی ہے۔ بلکہ اس میں مکمل قدرتی نقشہ اور پیدائش کی سچی فلاسفی کا فوٹو کھینچا گیا ہے ۔

مجھے کامل یقین ہے کہ ناظرین ان چند اوراق کو جو ہدیہ ناظرین ہیں۔ پڑھکر محظوظ ہونگے ۔ (ملک و قوم کا خادم۔ اکسیر سیالکوٹی۔ سوتر منڈی لاہور)

فصل اوّل

جسم۔ روح۔ زندگی کا نتیجہ۔ موت کیا شے ہے؟

روح کی حقیقت تو خدا جانے۔ لیکن جسم انسانی کی حقیقت بھی دس بیس لاکھ میں سے کسی ایک بندۂ خدا کو معلوم ہے۔ آؤ ذرا غور کریں۔ کہ جسم انسانی کی کیا حقیقت ہے۔ اس کا مطالعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ یہ خاک کا پتلا جو ایک مقرر بی جیو ان سے بڑھتے بڑھتے ایک مرد مقطع اور وجیہ بن گیا ہے۔ جو اکڑ اکڑ کر چلتا ہے۔ اور اپنے دیگر ہمجنسوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض وقت اس کے غرور کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ آؤ ذرا دیکھیں تو سہی یہ کیا چیز ہے کیمسٹری ہمیں بتلاتی ہے کہ ایک حسین و دلفریب لیڈی اور عقلمند سے عقلمند کے جسم کا مادہ وہی ہے۔ جو انڈے کی سفیدی میں ہم پاتے ہیں۔ ایک ہزار بیضے مرغ لے لو۔ اگر تم میں جان ڈالنے کی طاقت ہو تو تم اس سے ایک شکسپیئر یا رستم یا ارسطو بنا سکتے ہو۔ لیکن بدقسمتی سے یا یوں کہنا چاہیئے خوش قسمتی سے جس مصالحہ سے آدمی بنتا ہے۔ وہ تو دنیا میں بے انتہا موجود ہے۔ لیکن اس کو ایک

زندہ کی شکل میں ڈھالنا انسان کے دستِ قدرت سے باہر ہے۔ تاہم دیکھنا چاہیئے کہ کیسی عام چیزوں سے جسم انسان مرکب ہے۔ اگر ہم ایک اوسط درجہ کے آدمی میں جس کا وزن ۲ من ۴ سیر ہو۔ اور اس میں سے گیس اور کاربن نکال لیں۔ تو صرف ۲½ سیر وزن باقی رہ جائیگا۔ گویا جسم انسان ایک ہوا کا تھیلا ہے۔ یعنی اس میں ۵/۶ حصہ گیس ہے۔ صرف ہوا ہی ہوا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ ۲ من ۴ سیر وزنی آدمی میں ۵۹ سیر تو آکسیجن ہے۔ یہ گیس اگر باہر نکال لی جائے۔ تو ۱۲ فٹ لمبے ۱۰ فٹ چوڑے ۱۵ فٹ اونچے کمرے میں سما سکتی ہے۔ اور اگر اس کے جسم سے ہائیڈروجن بھی نکال لیویں۔ تو ۷½ سیر وزن اور کم ہو جائیگا لیکن یہ گیس ۱۵ فٹ مربع اور ۱۲ فٹ بلند کمرے میں سمائیگی۔ اور اگر اس کو پیپوں میں بھر لیا جائے۔ تو متعدد آدمیوں کو بادلوں کے اوپر لے جا سکتی ہے۔ اب ہمکو اس شخص کے ۲ من ۴ سیر وزن میں سے صرف ۲½ سیر کا جائزہ لینا باقی رہ گیا ہے۔ اس میں ۹ نہایت کارآمد چیزیں شامل ہیں۔ اس میں ۱۸ چھٹانک تو کیلشیم ہے۔ جس کو چونا کہتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ۲½ چھٹانک فاسفورس ہے۔ اس فاسفورس سے اگر تم دیاسلائیاں بنانی چاہو تو اسقدر بن سکتی ہیں۔ کہ بنارس کے ہر ایک مرد۔ عورت اور بچے کو ایک ایک دیاسلائی تقسیم کر سکیں۔ کیلشیم اور فاسفورس نکال لینے کے بعد اس بیچارے کے جسم میں صرف ۳ چھٹانک وزن باقی رہ گیا ہے۔ اور یہ مجموعہ ہے۔ سوڈیم۔ گندھک۔ فلورین۔ کلورین۔ میگنیشیم۔ پوٹاشیم اور سلیکن کا جو ایک سو دو رتی سے دو چھٹانک اور آدھی چھٹانک تک علی الترتیب موجود ہیں ؎

یہ چودہ عنصر باہم اس طرح ملے ہوئے ہیں۔ کہ جسم انسان کی مشین کو باقاعدہ طور پر چلاتے ہیں۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن ملکر ہمارے ۲ من ۴ سیر والے آدمی میں ایک من ۲ سیر رطوبت بناتے ہیں۔ کلورین اور سوڈیم ملکر نمک بناتے ہیں۔ جو ۳½ چھٹانک کے قریب ہوتا ہے۔ اور سوڈیم کاربن اور آکسیجن سے ملکر ہڈیوں کی ساخت میں مدد دیتا ہے۔ [illegible] عجیب کارخانہ ہے۔ کہ جس میں کیمیاوی ترکیبوں سے بہت سی چیزیں اپنی ضرورت کے مناسب [illegible] ملتی رہتی ہیں۔ صابن اسمیں بنتا ہے۔ جو تمام رگوں اور انتڑیوں کو دھوکر میل کچیل سے صاف کرتا ہے۔ اور گلیسرین اسمیں پیدا ہوتا ہے۔ جو مشین کے اندرونی پرزوں کو چکنا رکھتا ہے۔ شکر سازی کی تو گویا یہ کل ہے۔ کہ روٹی لعاب دہن سے ملتے ہی شکر

جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گوند۔ الکحل وغیرہ جوہر تیار ہوتے ہیں۔ یہ ہے جسم انسان کی حقیقت۔ یہ ہے اس خاک کے پتلے کی اصلیت ؛

اب جسم انسان کی حقیقت تو معلوم ہو چکی۔ آؤ ہم اس سوال کا فیصلہ کریں۔ کہ جسم انسانی کن کن چیزوں سے بنا ہے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے اجزاء انسانی کے چند اصول قایم کئے ہیں۔ جو ہماری دانست میں بالکل درست ہیں۔ ہم ناظرین کی دلچسپی کیلئے مختصر طور پر ذیل میں درج کرتے ہیں۔ وہ تین متعدد چیزوں یعنی جسم۔ زندگی اور روح کے اجتماع کا نام انسان ہے۔ کم علم اور مادہ پرست فلاسفر روح اور زندگی کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ روح اور زندگی دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ زندگی فانی ہے۔ مگر روح غیر فانی اور ابدی ہے۔ زندگی ایک عارضی حالت ہے۔ جس کا ضایع ہونا ضروری امر ہے۔ مگر روح ایک ایسی چیز ہے جس پر کسی جُدائی کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ نہ موت اُسکو مٹا سکتی ہے۔ نہ پانی گلا سکتا ہے۔ نہ آگ جلا سکتی ہے ؛

مندرجہ بالا اصول کو مدِ نظر رکھکر اگر ہم انسان کی تعریف میں یہ کہیں کہ وہ مجسم روح ہے۔ جو جسم کے اندر رہتا ہے۔ تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس تعریف سے ہم کو موت کے بیان میں یہ ظاہر کرنے کی چنداں ضرورت نہ رہیگی۔ کہ انسان کیا ہے ؛

سچ پوچھو تو موت جسم اور روح کی جُدائی کو کہتے ہیں۔ اور یہ جُدائی اُس وقت واقع ہوتی ہے۔ جب زندگی جسم کو قایم رکھنے سے قاصر ہو جاتی ہے ؛

نباتات اور حیوانات کی زندگی کے لئے چند حالتیں اور خصوصیتیں ضروری ہیں۔ مثلاً نباتات ہوا اور پانی کے بغیر حیوانات ہوا کے بغیر اور مچھلیاں پانی کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتیں بعض بعض زندگیوں کے لئے تو اور بھی خاص شرائط کی ضرورت ہے۔ مثلاً بعض قسم کے کیڑے صرف کاربونک ایسڈ میں ہی زندہ رہ سکتے ہیں ؛

وہ مچھلیاں جو ہمیشہ سمندر میں رہتی ہیں۔ دریا یا تالاب کے تازہ پانی میں آکر ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتیں۔ جبتک کہ پانی سمندر کے پانی کے مانند قدرے کھاری نہ ہو؛ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ ہر ایک زندگی کے لئے کسی خاص قسم کی سکونت ضروری ہوتی ہے۔ روح بھی اس قاعدہ سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بھی جسم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جس طرح مکان میں آگ لگ جانے اور اُس کے برباد ہو جانے سے

اُس مکان میں بود و باش رکھنے والے اُسکو چھوڑ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس طرح روح بھی جسم کے لقمۂ اجل ہو جانے پر جسم کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوتی ہے ؛

اس جگہ ایک ذراسی توضیح کی اور ضرورت ہے۔ اور وہ یہ کہ اتحاد ثلاثہ کا یہ اصول صرف انسان ہی کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ کل حیوانات میں کام کرتا ہے۔ کیونکہ ایسا کون حیوان ہے جس میں انسان کی طرح زندہ جسم اور روح نہیں ہوتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حیوانات کی روح انسانوں کی روح سے گھٹیا اور کم درجہ کی ہوتی ہے۔ اور اسی مناسبت سے ان کی ذہنی اور جسمانی قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو حیوانات پر شرف اور فوقیت حاصل ہے۔ ورنہ ساخت جسمانی میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ مانٹ پلیسٹر صاحب کا ہماری رائے سے بہت اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ حیوانوں کی روح ہی صرف انسانوں کی روح سے گھٹیا اور کم درجہ کی نہیں ہوتی۔ بلکہ ساخت جسمانی میں بھی کچھ فرق ہوتا ہے۔ ہم آگے چل کر کسی جگہ انسان اور حیوان میں فرق اور امتیاز کرنیوالی باتوں کا واضح طور سے ذکر کرینگے ؛

فصل دوم

موت کے بعد جسم اور زندگی اور روح کس حالت میں رہتے ہیں؟

روح کے جسم سے نکل جانے کے بعد جسم میں خواہ وہ انسان کا ہو یا حیوان کا کیمیائی قوتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے ؛

ہاں اگر اس جسم کو کسی ایسے مقام پر جہاں سردی صفر درجہ کی ہو یا جس جگہ کی ہوا آیئر پمپ کے ذریعہ سے بالکل خارج کر دی گئی ہو۔ رکھدیا جائے۔ تو وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیگا۔ جیسی کہ روح نکلنے کے وقت اُس کی حالت تھی۔ لاش اس اصول پر محفوظ رکھی جاتی ہے۔ اگر لاش میں کیمیائی مصالحہ بھر دیں۔ تو وہ سڑنے نہیں پاتی۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ اگر لاش کو صفر درجہ کی سردی میں رکھا جائے۔ تو اس پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوتا حرارت کی کمی کی وجہ سے اُس کی حالت ویسی ہی رہتی ہے جیسی کہ روح کے جسم سے نکلنے کے وقت تھی۔ اگلے زمانہ میں بستمہ ہاتھیوں کی پوری پوری لاشوں کو جو اُس زمانہ میں ہوتے

تھے۔ اسی طریقہ اور ترکیب سے زیادہ دیر تک محفوظ رکھتے تھے۔ شمالی ممالک میں جب لوگ لاشوں کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ تو وہ صرف برف کے دو ٹکڑے لاش کے اوپر نیچے رکھدینے سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں ؛

جب انسانی لاش پر ہوا۔ پانی اور درمیانہ درجہ کی حرارت کا اثر پڑتا ہے۔ تو آہستہ آہستہ اس میں کچھ فرق پڑنے لگ جاتا ہے۔ آخرکار وہ کاربونک ایسڈ گیس اور بعض دوسری مرکب حالت اختیار کر لیتی ہے ؛

جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے۔ تو وہ مرکبات بخار بنکر ہوا میں ملتے ہیں۔ اور پھر انجام کار مینہ بنکر زمین پر برستے ہیں جنہیں نباتات کی چھوٹی چھوٹی جڑیں جذب کر لیتی ہیں اور پھر انہیں کی وجہ سے نشو و نما پاتی ہیں۔ اس طرح وہ گیس ہی جو ہوا میں پھیل گئی ہے۔ پانی کی صورت میں زمین پہ آتی اور نباتاتی زندگی کی تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ پانی سے جو گیسیں نکلتی ہیں۔ وہ زمین میں داخل ہو کر جڑوں کی راہ سے درختوں میں جاتی اور پھر ان کی غذا بنتی ہیں۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا۔ کہ جسم کا مادہ تولید خواہ وہ انسانی ہو۔ یا حیوانی کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ صرف اسی کی صورت میں تبدل واقع ہوتا ہے ؛

مادی اشیاء کبھی جسم انسان بن جاتی ہیں۔ اور کبھی وہ جسم حیوانی اختیار کرتی ہیں۔ اور کبھی جسم نباتات۔ غرضیکہ اسی دائرہ میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ اس اصول کو ہندو ازل سے مانتے چلے آتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ خصوصیات جسم کی ہیں۔ مگر زندگی میں یہ بات مطلق نہیں ہے۔ وہ تو گرمی روشنی اور بجلی کی مانند گویا ایک قوت ہے۔ جو پیدا ہوتی اور ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک شعلہ ہے۔ جو بجھنے کے بعد پھر روشن نہیں ہو سکتا۔ زندگی میں اتنی قوت نہیں۔ کہ وہ اپنے تئیں برقرار رکھ سکے ؛

پس غیر فانی اور ابدی روح کے مقابلہ میں زندگی کی حقیقت اور وقعت کچھ نہیں ہے۔ روح کل کائنات میں ایک خاص چیز ہے۔ اور جسم و زندگی محض ہیچ ہیں۔ جسم تحلیل ہو کر دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زندگی بالکل فنا ہو جاتی ہے۔ مگر روح کے لئے نہ تحلیل کا عمل ہے نہ فنا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتی ہے۔ کیونکہ وہ غیر فانی اور ابدی ہے۔ ہم موت کے بعد جسم اور زندگی کی حالت کا تو ذکر کر چکے۔ اب روح کی نسبت بتانا باقی ہے کہ موت کے بعد اس کی کیا حالت ہوتی ہے ؟ ؛

دُنیا کا کوئی حکیم اور فلاسفر جسکو اس وسیع۔ ازلی اور ابدی کائنات کے علم سے کچھ واقفیت حاصل ہے۔ اس بات پر ہرگز یقین نہیں کرسکتا۔ کہ ہماری روحانی زندگی ہی جسمانی زندگی کی طرح معدود حالت میں ہے ؁

یہ اکثر مرتبہ دیکھا گیا ہے۔ کہ انسان بیس اور تیس سال کی عمر میں لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چند ماہ یا چند لمحہ ہی زندہ رہ سکیں۔ تمام دُنیا کی آبادی کا چوتھائی حصہ انسان سات سال کی عمر میں ہی مرجاتے ہیں۔ نصف کے قریب سترہ سال کی عمر میں عالم جوانی میں اس سے بھی پہلے اس دُنیا کو چھوڑ جاتے ہیں۔ باقی جو بچتے ہیں۔ اُنکو استحقاق مخصوصہ حاصل ہوتے ہیں۔ جنسے انسان کی بقیہ سائنس محروم رہ جاتی ہے ؁

اگر دُنیا یا مختلف دُنیاؤں کی زندگی کا انسانی زندگی کے قیام سے مقابلہ کریں۔ تو کیا یہ اس کے سامنے ایک لمحہ سے زیادہ معلوم ہوگا؟ ہماری زندگی تو ایک واقعہ گذران ہے۔ جو ذراسی دیر میں ختم ہوجانیوالی ہے۔ اور بمشکل تمام قدرت کی تاریخ میں جگہ حاصل کرسکتا ہے ؁

علاوہ ازیں اپنی فطرتی حالت کے لحاظ سے بھی انسان چنداں قابل رشک حالت میں نہیں ہے۔ وہ ہر قسم کی شکلوں اور مصیبتوں سے لڑتا رہتا ہے۔ اور چونکہ جسم کی بناوٹ ناقص ہے۔ اسلئے اسکو ہمیشہ کسی نہ کسی مصیبت کا کھٹکا لگا ہی رہتا ہے ؁

یہ تو آپ پر بخوبی روشن ہوگا۔ کہ انسان دُنیا میں ننگا مادرزاد پیدا ہوتا ہے اسکے پاس اپنے جسم کے چھپانے تک کا بھی ذریعہ نہیں ہوتا ؁

اس میں شک نہیں کہ یورپ اور امریکہ کے بعض شائستہ ملکوں میں لوگ متمول حالت میں ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی آسائش اور آسودگی کا سامان مہیا کرلیتے ہیں۔ مگر اگر آپ افریقہ اور ایشیا کے باشندوں کو دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ انکی زندگی کیسی پُرماز تکالیف ہے۔ پھر اس زمانے کا خیال کرو۔ جب کروڑوں برس پہلے یہ تہذیب اور شائستگی کا زمانہ نہ تھا۔ اُس وقت انسان کی کیا حالت ہوگی ؟ ؁

یہ بھی تسلیم کیا جاچکا ہے۔ کہ انسانی زندگی فطرتاً اور اخلاقاً بھی مصیبت ہی مصیبت ہے۔ اور اسمیں آرام ملنا بالکل غیر ممکن ہے۔ کتب مقدسہ میں لکھا ہے کہ دنیا سئے مشک کا نام دُنیا ہے۔ گو ان الفاظ میں بظاہر شاعرانہ مبالغہ معلوم ہو۔ مگر اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ ایک

سچی بات ہے۔ دُنیا میں انسان ہر طرح ناکامیاب ہی رہتا ہے۔ محبت میں ناکام۔ خواہش برآری میں ناکام۔ ارمان وغیرہ میں ناکام۔ غرضیکہ روح کے جذبات کے ہر معاملہ میں اسکو ناکامی ہی ناکامی ہوتی ہے۔ اور اگر کبھی خوشی بھی ہوتی ہے۔ تو وہ چند لمحہ کی خوشی سخت سے سخت رنج میں بدل جاتی ہے۔ دراصل ہم اس لئے دوسروں سے محبت کرتے ہیں کہ ہم کو انکی جدائی کا غم سہنا پڑے۔

نظام کائینات میں قاعدہ اتحاد اور تکمیل موجود ہے۔ اور اس لئے خیال پیدا ہوتا ہے کہ عالم اخلاق میں بھی ایسا ہی نظام اور قاعدہ ہونا چاہیئے۔ مگر جب ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ تو مجبور ہو کر یہی کہنا پڑتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو۔ ماننا پڑتا ہے۔ کہ دُنیا کیلئے صرف مصیبتیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ہر طرف ظلم وستم۔ زبردستی کا بازار گرم ہے۔ گویا مظلوم ظلم سہنے اور ظالم ظلم کرنے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ حالت بالکل ناپائیدار اور عارضی ہے۔ گویا یہ ایک چھوٹی سی ندی ہے۔ جس کو ہم بہت جلد عبور کر کے دائمی مسرت کو حاصل کر سکتے ہیں۔

مگر اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ مقام مسرت کونسا ہے۔ اور وہ نئی زندگی کونسی ہوگی۔ جو اس عارضی زندگی کے بعد ہمکو میتسر ہوگی۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیئے۔ کہ ان دنیاوی تعلقات سے چھوٹ کر ہماری روح کہاں جائیگی؟

بس ہمارا مدعا اس کی تحقیقات کرنا ہے۔

دُنیا کے تمام زبانوں میں اس مخلوق کے لئے جو کائینات عالم میں موجود ہے اور انسان سے ہر طرح بہتر ہے۔ کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ مذہب عیسوی اور مذہب اسلام نے ان کا نام فرشتہ قرار دیا ہے۔ اور ہندو دھرم اسی مخلوق کو دیوتاؤں کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ مگر ہم اس مخلوق کو فوق البشر کے نام سے مخاطب کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا درجہ ہم سے بالا ہے۔ اور وہ اس ارضی منزل کو طے کر کے بالائی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔

فصل سوئم

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ مفردات ثلاثہ میں سے صرف ایک روح ہی ازلی۔ ابدی ہے اور غیر فانی ہے۔ جب جسم پراگندہ ہو کر ذخیرہ میں مل جاتا ہے۔ زندگی فنا ہو جاتی ہے۔

اور روح خاکی قالب سے نکل جاتی ہے۔ اسوقت اسکو نیا جسم اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو اس خاکی قالب کی نسبت زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ پس ہم نے اسی روح اور قالب کا نام فوق البشر رکھا ہے۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا جائے سکونت کہاں ہے۔ ہم اس سوال کا جواب آگے چل کر دینگے ؛

دُنیا کے کل اہل علم اصحاب اسبات پر متفق ہیں۔ کہ ہمارا تمام کرہ زندہ مخلوق سے بھری ہوئی ہے۔ تمام دُنیا جاندار اور ذی روح مخلوق سے بھری ہوئی ہے۔ تم اگر کسی کھیت میں سے گھاس کا ایک چھوٹا سا تنکا توڑو۔ اور اسکو خوردبین کے ذریعے سے دیکھو۔ تو اسمیں چھوٹے چھوٹے کیڑے نظر آئینگے۔ گویا یہ گھاس کا تنکا ان چھوٹے چھوٹے اور منحنی مخلوق کا ملجا و ماوا ہوگا۔ وہ کیڑے اسی تنکے میں پیدا ہوتے پلتے بڑھتے اور مرجاتے ہیں۔ اور یہ کل کام اس تیزی اور سُرعت سے انجام پا رہے ہیں۔ کہ انسان انکو کسی طرح بھی نہیں سمجھ سکتا ؛

اب آپ آب رواں کو لیں۔ اسمیں بھی لاتعداد ذی روح بھرے پڑے ہیں۔ دریائی جانوروں اور پودوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ذی روح مخلوق ہے۔ جنکو ہم برہنہ آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اگر آپ ایک قطرہ آب لیکر خوردبین سے دیکھیں۔ تو اسمیں آپکو ہزاروں جانور رینگتے ہوئے نظر پڑینگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک قطرۂ آب بیشمار ذی روح کا مسکن ہے ؛

بظاہر نظر آنیوالے جانور مثلاً مچھلی۔ سیپ وغیرہ کو چھوڑ کر صرف اسی ایک قطرہ آب پر ذی روح کی تعداد کا قیاس کرنے سے جو خوردبین سے نظر آتی ہے۔ آپ تمام سمندر دریا جھیل اور خلیج وغیرہ کا حساب لگا سکتے ہیں ؛

اس جگہ ہم ایک تذکرہ جس کو علم طبقات الارض کے واقف کار بخوبی جانتے ہیں۔ مناسب سمجھتے ہیں جسقدر علاماتیں [illegible] ہیں۔ اور دریا اور سمندروں کے کنارے پر پہاڑ کھڑے ہیں یہ کھریا مٹی کے ٹیلے وغیرہ۔ ان میں اب تک بکثرت سنکھ اور گھونگے وغیرہ جانوروں کے جسم کے بعض حصص پائے جاتے ہیں۔ ان میں بہت سے جانور موجود ہیں۔ جنکو صرف خوردبین سے ہم دیکھ سکتے ہیں پس خیال کیجئے۔ کہ جب اُس زمانہ میں اس کثرت سے ذی روح بستے ہونگے۔ قدرتی حالت کے لحاظ سے اس قدیم زمانہ اور موجودہ زمانہ میں بہت ہی کم

فرق پیدا ہوا ہے ؛

یہ ہوا ہی جو ہمارے گرد موجود ہے ۔ زمین اور سمندروں کی طرح ان گنت ذی روح کا مسکن ہے ۔ ہم اپنی ظاہر بین نظر سے صرف چند پرند ہوا پر اڑتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ مگر یہ بات اب پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے ۔ کہ اس ہوا میں اور بھی کروڑوں جانور بھرے پڑے ہیں جنکو ہم برہنہ آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے ؛

دیکھنے میں تو ہوا بالکل صاف معلوم ہوتی ہے ۔ مگر چونکہ روشنی اسکو اسقدر منور نہیں کرتی ۔ جسقدر کہ وہ دیگر چیزوں کو کرتی ہے ۔ اسلئے ہمکو وہ ذی روح اجسام جو اس میں اڑتے پھرتے ہیں ۔ نظر نہیں آسکتے ؛

جس طرح دن کے وقت کسی بند کمرہ میں سورج کی ایک شعاع آجاتی ہے ۔ تو اس کمرہ میں ادھر سے ادھر تک روشنی کی ایک لکیر سی دکھائی دیتی ہے ۔ اور صرف وہی لکیر روشن ہوتی ہے ۔ باقی کل کمرہ حسب معمول تاریک رہتا ہے ؛

بس اس روشنی کی لکیر کیطرح ہمارے تمام کمرہ کے ارد گرد روشنی موجود ہے ۔ اور اس سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے ۔ کہ تمام ہوا اسی طرح غبار کے ستونوں سے بھری ہوئی ہے ۔ اور یہ غبار ذی روح مخلوق اور نظر نہ آنیوالی نباتات کے بیج اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کے انڈوں سے بھرا ہوا ہے ؛

اکثر خودرو درخت جنکی بابت فرانس وغیرہ میں بہت کچھ مباحثے ہوچکے ہیں ۔ انہیں بیجوں سے پیدا ہوتے ہیں ۔ جو ہمیشہ کرۂ ہوائی میں چکر لگاتے اور تربیت و پرورش پاتے ہیں ۔ اور پانی یا زمین پر گر کر نشو و نما حاصل کرتے ہیں ۔ جو لوگ درختوں کو خودرو کہتے ہیں ۔ وہ سخت غلطی پر ہیں ۔ کیونکہ اب تک سائنس کے ذریعہ سے کوئی چیز ایسی معلوم نہیں ہوئی ۔ جس کی علت موجود نہ ہو ؛

پھر از ریٹ یعنی جراثیم ذی روح کی کثرت آج اور کل اور بھی زیادہ دیتے ہیں ۔ جراثیم نہایت ہی لطیف اور جاندار کیڑوں سے مراد ہے ۔ جو لاکھوں کی تعداد میں ہوا ۔ پانی خشکی تری کے ان طبقات میں مخصوص رہتے ہیں ۔ جہاں انکی پرورش کے لئے مواد ہمیشہ موجود ہو ۔ ان جراثیم میں سے بعض حیوانات اور انسان کے جسم میں داخل ہوتے ہیں ۔ اور وہاں اس قسم کے کیمیاوی عمل پیدا کرتے ہیں جنکا انتہائی نتیجہ مرض اور اکثر اوقات موت بھی ہوتی ہے

جراثیم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جو ایک دوسرے سے خواص۔ نتائج اور شکل و صورت میں مختلف ہیں۔ بعض باریک حلقہ نما شکل رکھتے ہیں۔ بعض کی بناوٹ عموداً واقع ہوئی ہے اور بعض تو محض چھلی کی طرح ہیں۔ جو ہر ایک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی پود اس تندہی سے بڑھتی ہے۔ کہ آدمی کے جسم میں ایک جرم داخل ہو کر ۲۴ گھنٹے کے اندر اپنی نوعیت کے ایک لاکھ جرم پیدا کر سکتا ہے۔ سرکہ یا کچی شراب کے برتن میں جب بلبلے اٹھتے ہیں۔ تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ جراثیم کروڑوں کی تعداد میں لگاتار پیدا ہو رہے ہیں۔ اور مسلسل طور پر زہریلی ہوا یعنی کاربانک ایسڈ گیس شراب کے برتن میں سے نکلتی رہتی ہے بحیثیت مجموعی اس حالت کو عمل تخمیر کہتے ہیں۔ جراثیم انسانی یا حیوانی جسم میں داخل ہو کر اس عمل تخمیر کے ذریعہ پرورش پاتے اور بڑھتے ہیں۔ بعض جراثیم کا اثر نہایت مہلک ہوتا ہے۔ اور بعض کا نہ صرف بے ضرر بلکہ انسانی زندگی کا جزو لازمی۔ سڑتے ہوئے گوشت کے ٹکڑے میں لاکھوں جراثیم ایسے ہیں۔ کہ زندہ اجسام کو ہی اس مردہ ٹکڑے کی شکل میں تبدیل کر دیں۔ لیکن چرٹ یا سگار پر جو سبز رنگ کی جھلی آجاتی ہے۔ وہ مضرت رساں ہونے کی بجائے انہیں اور بھی مزیدار بنا دیتی ہے۔ مردہ اجسام میں داخل ہو کر بعض جراثیم اس قسم کے اجزا پیدا کرتے ہیں۔ جو نباتات کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ ۵۰ سال کی مسلسل محنت کے بعد اہل سائنس نے دماغ کھپا کر آخر ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ کل بیماریاں انہیں ننھے ننھے جاندار جراثیم کی بدولت ہیں ؛

اب سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ یہ جراثیم حیوانات ہیں یا نباتات۔ فرانس کے مشہور مسیو پاسچر نے ان کی ماہیت کو دریافت کیا۔ تو انکا نام مائکروب یعنی لطیف جاندار جرم رکھا۔ یعنی جراثیم تو انسانی خون میں بھی موجود ہیں۔ اگر ان کی تعداد کم ہو جائے۔ تو صحت بگڑ جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح بعض نباتات کی زندگی کے لئے از بس ضروری ہیں۔ بعض جراثیم جنکا عمل پیدائش حیوانات کے لئے ہلاکت انگیز ہوتا ہے۔ نباتات کیلئے عمل اکسیر کا کام دیتے ہیں۔ بعض جراثیم جو پودوں کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ انسان کیلئے وہی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اہل سائنس کا خیال ہے کہ حیوان اور انسان کی پیدائش سے پہلے یہ جراثیم لاانتہا تعداد میں پانی اور ہوا میں گھومتے پھرتے تھے۔ اور زندگی کے حالات میں تبدیلی ہو جانے کے باعث انکی بناوٹ شکل اور خواص بھی بدلتے ہیں بہت سے

جرم جو زمانہ قدیم میں موجود تھے۔ اب نہیں ہیں۔ اور اُنکی جگہ ایک نئی قسم پیدا ہوگئی ہے
ان کی طرزِ پیدائش بھی قابلِ ذکر ہے۔ اُن میں نر۔ مادہ کی تشخیص نہیں ہوتی۔ یا یوں کہو۔ کہ
ہر ایک جرم نر بھی ہے۔ اور مادہ بھی۔ نر اور مادہ کا باہمی ملنے کے بغیر ہی ہر جرم بہت سے
ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ہر ٹکڑا از سر نو بہت سے حصّوں میں۔ اس طرح سلسلہ پیدائش
جاری رہتا ہے۔ ان کی نشو و نما انسانی بچّہ کی طرح نہیں۔ کہ آہستہ آہستہ بڑھتا اور انسان
بنتا رہے۔ بلکہ جرم پیدا ہوتے ہی اپنے خواص اور اپنے اثرات میں مکمل ہوتا ہے۔ بعض
سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کے خون میں لاکھوں جراثیم موجود ہیں ؛

پس اس ذی روح کی کثرت تعداد کا اندازہ کرلو۔ کہ سطح زمین پر تازہ پانی کے چشموں
میں اور کرہ ہوا میں کس قدر ذی روح مخلوق آباد ہے ؛

گویا ہمارے کرہ کی مثال ایک وسیع برتن کی سی ہے جس میں ذی روح کو دبا دبا
کر بھر دیا گیا ہے۔ مگر وہ برابر بکھرتے جاتے ہیں۔ مگر قدرت کے وسیع اختیارات کو صرف سطح
آب کرۂ ہوا اور زمین ہی پر محدود نہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کرۂ ہوا کے اوپر ایک دوسرا
طبقہ بھی ہے جسکو ایتھر (ہوا خالص) کہتے ہیں۔ یہ ہوا جو ہمارے گرد محیط ہے۔ اور جو
گردشِ زمین کے ساتھ اپنے طور پر گھومتی رہتی ہے۔ چنداں بلند نہیں۔ اسی کی اونچائی
کل ایک سو بیس میل ہے۔ جوں جوں زمین سے بلند ہوں۔ توں توں اسکی مقدار میں کمی پیدا
ہوتی جاتی ہے۔ بارہ میل بلندی پر انسان کو سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں سانس
لینے کے لئے ہوا کافی نہیں ہوتی۔ پانچ میل سے زیادہ بلندی پر انسان چڑھ نہیں سکتا کیونکہ
ہوا پانچ میل پر اسقدر لطیف ہو جاتی ہے۔ کہ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس
سے اوپر تو گھٹتے گھٹتے آخر کار بالکل ہی کم ہو جاتی ہے ؛

اب اس عدیم ہوا (ایتھر) کے وجود کی نسبت بحث کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا
جس طرح ہم ارضی ہوائی اجسام کے دباؤ اور رکاوٹ کو محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح ماہران
علم ہیئت و طبعیات گردش اجرام فلکی میں اس خالص ہوا کے دباؤ اور رکاوٹ کو بھی مانتے ہیں ؛

ہوائے ارضی کے بعد ہوائے خالص کا نمبر ہے۔ یہ نہ صرف سطح زمین کو ہی گھیرے
ہوئے ہے۔ بلکہ دوسرے سیاروں کو بھی اس نے گھیر رکھا ہے۔ اور زمین سے عرش تک پھیلی
ہوئی ہے۔ اور کل سیارے اپنے اپنے قمر کے ساتھ جو اس نظام شمسی کے متعلق ہیں۔ اس ہوا کے

خالص میں گھوم رہے ہیں۔ اور دمدار ستارے بھی اسی میں چکر لگاتے رہتے ہیں؛
بعض جاہل سمجھتے ہیں۔ کہ اس کرۂ ہوا کے اوپر خلا ہی خلا ہے۔ مگر انکو معلوم نہیں کہ قدرت کی یہ وسیع سلطنت گوناگوں اشیاء سے بھری ہوئی ہے۔ اور اسمیں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے۔ جہاں کوئی چیز نہ رہتی ہو۔ ہم کرۂ ارض و کرۂ ہوا و سطح آب کی ان گنت ذی روح مخلوق کا تو ذکر کر چکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس ہوائے خالص میں بھی کیا کوئی مخلوق آباد ہے؛

یہ ایسا سوال ہے جسکا جواب دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر اور طبیب دینے سے قاصر ہیں۔ مگر یہ کیسی تعجب انگیز بات ہے۔ کہ ہوا۔ پانی اور مٹی میں تو بیشمار ذی روح مخلوق آباد ہو۔ اور ہوائے خالص میں اس کا نام و نشان تک نہ ہو؛

اگر آپ غور کرینگے۔ تو آپ پر یہ بخوبی روشن ہو جائیگا۔ کہ ہوائے خالص یعنی ایتھر میں بھی مخلوق رہتی ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مخلوق کس قسم کی ہوگی؟ اس کے متعلق ہم بتلاتے ہیں۔ کہ یہ مخلوق وہ ہے۔ جسکا نام ہمنے فوق البشر رکھا ہے ہم ہوائے خالص کی ترکیب کیمیائی کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ کیونکہ علم طبعیات سے صرف اسکے وجود کی خبر ملتی ہے۔ اور اس سے اسکی بناوٹ کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ ہم قیاساً کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ہوائے خالص آکسیجن سے معرا ہوگی؛

ہوا میں آکسیجن ایک خاص جوہر ہے۔ اور جسقدر ہوا کی بلندی پر جاؤ۔ سانس لینے میں دشواری ہوتی جاتی ہے۔ یہ اسبات کا کافی ثبوت ہے۔ کہ بلندی پر آکسیجن گیس نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ طبقہ انسانی زندگی کے لئے مناسب اور اہل نہیں ہے؛

انسان غبارہ میں سوار ہو کر اسیطرح اوپر کو اڑتا ہے جسطرح پانی کے باہر مچھلی جاتی ہے۔ جہاں وہ حبس دم کی وجہ سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ اسیطرح انسان غبارہ میں بیٹھکر جسقدر آہستہ آہستہ اوپر کو چڑھتا اور ہوائے خالص کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اسیقدر اسکا دم گھٹتا اور سانس لینے کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ پس انہی وجوہات سے ہمارا یہ قیاس بالکل درست ثابت ہوتا ہے۔ کہ بالائی طبقہ میں آکسیجن گیس نہیں ہے؛

بعض بزرگ تو ہوائے خالص ہوا کے کرہ کو جنت یا بہشت کے نام سے موسوم کرتے ہیں ماننے میں بھی متفق ہوں پس یہ کہنا غیر مناسب نہوگا۔ کہ وہ فوق البشر بہشت میں رہتے ہیں؛

اس مسئلہ کو جو زبان زد خلائق ہے۔ بخوبی تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ اسکی تصدیق سائنس بھی کرتا ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے۔ جسکو زمانہ سلف کے حکماء اور فلاسفروں نے مشاہدوں اور تحقیقوں کے بعد معلوم کیا تھا؛

پس ہم کرۂ ہوائے خالص کو اسی نام سے موسوم کرتے ہیں جس نام سے وہ مذہب عیسوی۔ اسلام۔ بُدھ اور ہندو۔ مذہب میں مشہور ہے۔ اور اس اعلےٰ مخلوق کو ہم اہل بہشت کہتے ہیں؛

یہ وہ مسئلہ ہے۔ جس میں مذاہب سائنس اور واقعات سب کے سب اتفاق کرتے ہیں۔ ہم کو اس جگہ اس مسئلہ پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں؛

فصل چہارم

وہ لڑکے دوبارہ پیدا ہوتے ہیں جو بچپن میں مرجاتے ہیں

موت کو زندگی کی آخری منزل تصور کرنا سخت نادانی ہے۔ کیونکہ وہ صرف ایک تبدیلی ہے۔ ہم فنا نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔ مرنے کو بدانجامی اور صدمہ مت خیال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انسانی قسمت کی تماشہ گاہ کا ایک نیا اور زیادہ اثر انگیز منظر ہے۔ عالم نزع کو فنا کی تمہید خیال کرنا غلطی ہے بلکہ وہ قانون قدرت کی ہر تبدیلی کیساتھ ہونیوالی نزائید اور لازمی درد انگیز حالت ہے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے؟ کہ حشرات الارض کے عالم میں سرد اور بیحرکت بدن اپنے لباس ظاہری کو چاک کرنے کے بعد تتلی کی دلاویز اور خوشنما صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اگر آپ اس تتلی کو اسوقت دیکھیں جب وہ عارضی کفن یا جامہ تن کو چاک کرکے نکلتی ہے۔ تو وہ اس جسم کی زنجیر کو توڑنے کو مستعد اور کانپتی ہوئی نظر آئیگی۔ کیونکہ اسوقت اسکو قدرے آسائش کی ضرورت ہے۔ تاکہ اپنے حواس کو طبقہ ہوائی میں اڑنے کیلئے مجتمع کرے؛

پس اس مثال سے جو ہماری موت کا نمونہ ہے۔ ہمکو بھی صبر کے ساتھ موت کی تکلیف کو برداشت کرنا چاہیئے۔ تاکہ تتلی کیطرح اس مادی غلاف کو پیچھے چھوڑکر ہم بھی عالم بالا کی سیر کو چلے جائیں۔ اور یہ وہ منزل ہے۔ جو قبر کے بعد میسر ہوتی ہے؛

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا تمام روحیں بلا تخصیص فوق البشر کیحالت حاصل کرینگی۔ انسانی اوصاف بہت سے اخلاقی انقلاب اور خصائص سے مرکب ہیں انسانوں میں نیک بھی ہوتے ہیں۔ اور بد بھی۔ ایماندار بھی ہوتے ہیں۔ اور بے ایمان بھی۔ ہم خواہ کسی ملک یا حصے میں بستے ہوں۔ ہمکو چاہیئے کیسی ہی اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم ملی ہو۔ یا جہالت اور وحشت میں ہم تحت الثریٰ میں گر پڑے ہوں۔ مگر اخلاق کا قدرتی قانون کسی جگہ بھی بدلا ہوا نہ ملیگا ؛

تو کیا اب ہم یہ خیال کریں۔ کہ نیک و بد دونوں قسم کی روحیں بلا تخصیص و بلا تمیز فوق البشری کے اعلےٰ درجہ پر ممتاز ہوجائینگی ؟ ؛

کیا یہ دونوں اس نئی زندگی کی آبادی میں داخل ہونے کے لئے جو مرنے کے بعد حاصل ہوگی۔ بجائے خود ایک ہی سی ہونگی۔ اور کیا ان دونوں کو آسانی اور مشکلات کا سامنا یکساں کرنا پڑیگا ؟ ؛

ہمارا دل کہتا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نیک و بد میں تخصیص لازمی ہے ؛

مگر بجو سے دامنہ علیحدہ کئے جانے میں قدرتی قوتیں کیا کام کرتی ہیں؟ اور علیحدہ کرنے کا قاعدہ جس کا بیان نہایت مشکل ہے۔ کس طرح کام کرتا ہے ؟ ؛

اس کا جواب یہ ہے۔ ہوائے خالص یا بہشت میں پہنچنے کے لئے اور اسقدر بلندی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ روح اعلےٰ درجہ کی کمالیت حاصل کرے۔ یا یوں کہو کہ روح انتہا درجہ کی لطیف مجلےٰ اور خوشنما ہو۔ اگر اس میں یہ باتیں ہونگی۔ تو اس کو ضرور بہشت نصیب ہوگا۔ مگر جو لوگ غلیظ۔ بدچلن۔ عیاش اور بدنسل ہونگے۔ انکی روح کا جلا پانا اور منور ہونا ناممکن بات ہے۔ پس اسلئے وہ جذبات ہوا و کثافت حیوانی و شہوانی کے باعث سے پستی کی جانب جھکے رہینگے۔ وہ معراج کمال اور منزل مقصود یعنی درجہ ہوا اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور ہمیشہ اس فانی دنیا میں جو غم اور الم کی مسکن ہے۔ پڑے رہینگے ؛

یہاں پر یہ کہنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر زندگی کے آغاز میں اسکو گذشتہ زندگی کے واقعات یاد نہیں رہتے ؛

مگر یہاں پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ روح کو واقعات گذشتہ کس لئے یاد نہیں رہتے ؟ اور جب اسکو وہ واقعات ہی یاد نہیں رہتے۔ تو اسلئے زندگی سے اسکو کیا واسطہ

اور اس کو دوبارہ پیدا ہونے سے فایدہ ہی کیا؟ ٭

یہ اعتراض فوق البشر کی حالت میں تو صحیح ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اگر ہمکو فوق البشر ہونے کے بعد بھی واقعات یاد نہ رہیں تو بیشک ہمارا فوق البشر ہونا اور نہونا یکساں ہے؟

مگر دُنیا میں جو ہم کچھ وقوں کیلئے اپنی حالت کو بھول جاتے ہیں۔ اسکو ہماری زندگی کی عارضی حالت اور سابقہ غلطی کی سزا سمجھنا چاہیئے۔ جب ہم فوق البشری کے درجہ پر پہنچ جائینگے۔ تو خودبخود دنیاوی زندگی کے تمام واقعات یاد آجائینگے۔ اور اُس وقت ہر بشر یاد کرسکیگا۔ کہ اسے کتنی مرتبہ تبدیل قالب کرنے کے بعد یہ اعلےٰ مرتبہ نصیب ہوا ہے ٭

جو لوگ ہماری رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اُن کو یہ جواب دیا جاسکتا ہے۔ کہ موت کے بعد جزا و سزا کا مسئلہ تو ایسا ہے۔ جسکو ہر بنی نوع انسان مانتا ہے۔ پھر تم کیوں نہیں مانتے۔ اس کی وجہ؟ ٭

دُنیا میں دوسری مرتبہ جنم لینا ہر طرح قرین قیاس اور مناسب سزا معلوم ہوتی ہے اور یہ اسکی نسبت بدرجہا بہتر ہے۔ کہ کوئی شخص ہمیشہ تا حشر دوزخ میں رہے۔ تھوڑی سی خطا پر انسان کا ہمیشہ مبتلائے عذاب رہنا کیا عقل سلیم قبول کرسکتی ہے۔ ہماری بیان کردہ سزا رحیمانہ سزا ہے۔ کیونکہ یہ اسطرح قرین قیاس اور ممکن ہے۔ کہ اس سزا کے بعد انسان جن جذبات و شہوات نے اسکو گمراہ کردیا تھا۔ انکو مغلوب کرسکے۔ اور اسطرح پھر اُن برکات کو حاصل کرسکے۔ جنسے وہ محروم ہوچکا ہے ٭

بس ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر انسانی روح اسقدر عروج حاصل نہ کرسکے۔ کہ بہشت تک جا پہنچے۔ اور کمزور ہوکر نیچے گر پڑے۔ یا غضب وغصہ بدی و بُرائی کی وجہ سے خراب ہوجائے۔ تو اس حالت میں وہ کسی صورت میں بھی اس دُنیا سے باہر نہیں جاسکتی۔ جب اسکا پہلا جسم مرجائیگا۔ تو وہ دوسرا جسم اختیار کریگی۔ اور پہلی زندگی کے واقعات سے بالکل بیخبر ہوجائیگی۔ اور جسم ثانی میں وہ گناہ آلودہ روح پھر اوصاف حسنہ سے محروم رہ کر نئی اخلاقی تعلیم شروع کریگی۔ اور یہ شخص پھر ایک بچہ کی صورت میں جنم لیکر کمزور روح کے ساتھ جو موت کے وقت تھی۔ از سر نو زندگی شروع کریگا ٭

اس قسم کے تناسخ اور تبدیل قالب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ جبتک انسان کافی طور سے روحانی نشو و نما حاصل نہ کریگا۔ اسے عروج اعلےٰ کے قابل کمال پیدا نہ ہوسکیگا۔ اور وہ

عام انسانوں کی طرح دُنیا کا ہی ہو کر رہیگا ؛

مگر جو روح کثافت ہائے دنیوی سے پاک صاف ہے۔ وہ موت کے بعد ایک نیا جسم اختیار کر کے اس صاف ہوا کے طبقہ میں جا سکتی ہے۔ جسکو بہشت یا جنت یا سورگ کہتے ہیں ؛

اس جگہ یہ بتلا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ تمام بچے جو ایام طفولیت ہی میں مرجاتے ہیں۔ پھر دوبارہ جنم لیکر نئی زندگی حاصل کرتے ہیں ؛

فصل پنجم

فوق البشر کے اوصاف کے بیان میں

اب ہم اس پاک اور نورانی مخلوق کا ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں جو اس خالص ہوا یعنی بہشت میں ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر ہم اب فوق البشر کی شکل وصورت وغیرہ کی تحقیقات کرتے ہیں ؛

جسطرح انسان جسم روح اور زندگی سے مرکب ہے۔ اسی طرح وہ نورانی مخلوق (فوق البشر) بھی ان تینوں چیزوں سے ہی مبنی ہے یہاں ہم علیحدہ علیحدہ ان تینوں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں ؛

جسم

یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کہ ہم اس روحانی مخلوق کو بے جسم اور صرف خالص روح ہی تصور کرلیں۔ کیونکہ مادہ سے قطعی بے تعلق ہونا صرف اسی مخلوق کے لئے ممکن ہے۔ جو اپنی اخلاقی حالت میں فوق البشر پر بھی فوقیت رکھتی ہو۔ اس مخلوق کا ہم آگے چل کر ذکر کرینگے ؛

ہمارا خیال ہے کہ فوق البشر مخلوق مادی جسم رکھتی ہے۔ اور اسکے جسم ہمارے جسموں سے افضل اور برتر ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ جسم کس صورت وشکل کے ہونگے ؛

ناظرین! آپ نے بعض تصویروں کو دیکھا ہوگا۔ کہ مصور فرشتوں کی شکلیں۔ نوجوان اور حسین بچوں کی سی کھینچا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے۔ کہ اُنکے کندھوں پر

اُڑنے کیلئے پر بھی لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تصویر شاعرانہ خیالات کا نتیجہ ہے۔ جو ہمارے خیال میں بالکل غلط ہے۔ کیونکہ فوق البشر بہشت کی نورانی مخلوق ہے۔ جیسے خیالی صورت میں لانے کی کوشش کرنا بیفائدہ ہے۔ بعض مصوروں نے فرشتوں کی تصاویر کھینچتے وقت اُن کے سر کی شکل زیادہ بنا دی ہے۔ اور کندھوں پر پر بھی لگا دئے ہیں۔ یہ بتلانے کیلئے کہ اُنکی دماغی قوتیں انسان کی دماغی قوتوں سے بہت زیادہ ہیں ؛

ہوائے خالص کی باشندوں کی شکل وصورت کا پوری طرح سے نقا کھینچنا بہت مشکل ہے ؛

پس ہم صرف اسی دعوے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ کہ چونکہ وہ طبقہ لطیف ہے اسلئے وہ مخلوق بھی جو اس طبقہ میں بود و باش رکھتی ہوگی۔ لطیف اور سبک جسم رکھتی ہوگی ؛

یہ کہنا کہ فوق البشر کی شکل وصورت ایک حباب کی طرح پاک۔ صاف نازک اور لطیف ہوگی۔ کچھ بیجا نہ ہوگا ؛

اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ پھر وہ جسم کس طرح پرورش پاتا ہے؟ کیا اسکو بھی انسان اور حیوان کی طرح غذا کی ضرورت ہے ؛

اسکا جواب یہ ہے کہ فوق البشر مخلوق کے لئے غذا کا متلاشی ہونا جو اس دُنیا والوں کے واسطے اہم اور ایک خاص مصیبت ہے۔ ضروری نہیں ہے۔ وہ اسی خالص ہوا کو پیتے اور کھاتے ہیں۔ اور یہی خالص ہوا اُن کے جسم کو ترو تازہ رکھتی ہے ؛

اس جگہ پر ہم جانوروں کی غذا کی جانب متوجہ ہونا مناسب سمجھتے ہیں ؛

اکثر جانوروں کو اور خاصکر وہ جو آبی ہیں۔ زیادہ بھوک لگتی ہے۔ وہ ہر وقت کھاتے ہی رہتے ہیں۔ اگر وہ نہ کھائیں۔ اور اُنکا پیٹ خالی رہے۔ تو وہ فوراً مر جائیں۔ مگر بڑے جانوروں کی بھوک کا یہ حال نہیں۔ وہ ہر وقت کھاتے نہیں رہتے۔ کیونکہ ہوا اُنکی اندرونی ہے اور جب وہ سانس لیتے ہیں۔ آکسیجن گیس اور تھوڑی سی نائیٹروجن گیس جو کہ ہوا میں ملنے کے لئے غذا کا نعم البدل بنتی رہتی ہے ؛

یہ تو ہوا اُن جانوروں کا حال جو کھاتے نہیں۔ اب اُن جانوروں کا حال سُنئے جو پانی نہیں پیتے ؛

جزائر ہوائی میں ہزار ہا گھوڑے اور مویشی اپنی تمام زندگی بھر پانی نہیں پیتے

یہ مویشی پہاڑوں کے اوپر رہتے ہیں۔ اور موسم برسات کے سوا وہاں کوئی چشمہ یا ندی نظر نہیں آتی۔ لیکن ایک قسم کی عرق دار گھاس ہوتی ہے۔ جسکو بینیا کہتے ہیں۔ جو خوراک اور پانی دونوں کا کام دیتی ہے ؛

انسان ان سے بھی زیادہ فائدہ میں ہے۔ سانس کا متواتر اور زور سے لینا اس کیواسطے مفید ہے۔ کیونکہ اسکے باعث اسکے اعضا اور حواسوں کی تندرستی قائم رہتی ہے۔ آکسیجن۔۔۔ گیس جو سانس کے ساتھ اندر جاتی ہے۔ وہ غذا کا کام دیتی ہے چونکہ پہاڑی انسان سے بھی زیادہ سانس لیتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ان کے شکم میں آکسیجن زیادہ جاتی ہے۔ اور ہم انکو بھوک کم لگتی ہے ؛

مندرجہ بالا کو مدِ نظر رکھکر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ فوق البشر اپنے جسم کی پرورش کے لئے ہوائے خالص ہی سانس لیتے ہونگے۔ اور انکو زندگی میں سوائے ہوا کے اور کسی دوسری چیز کے کھانے پینے کی ضرورت نہ ہوتی ہوگی ؛

دُنیا میں غذا ایک ایسی چیز ہے جس کے باعث انسانی زندگی تلخ اور غم انگیز ہوگئی ہے۔ حیوانات تک غذا کی خاطر آپس میں باہم لڑتے اور جھگڑتے ہیں۔ انسان ہر روز روزگار کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ محنت اور مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اگر وہ صرف کھاکر زندہ رہ سکتا۔ تو اس کا نتیجہ یعنی دُنیا میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہوجانا معمولی بات تھی نہ یہ ہر روز کے جھگڑے رہتے۔ اور نہ نفرت جنگ و جدل۔ دنگہ۔ فساد۔ خونریزی اور رقابت وغیرہ کا دُنیا میں نام ونشان ہوتا۔ اور وہ وقت جس کو اہل سخن سنہری زمانہ کہا کرتے ہیں۔ دنیا میں آجاتا۔ تمام طبیعتیں بدل جاتیں۔ غرضکہ دنیا کے تمام کاموں میں ردّ و بدل ہوجاتا ؛

یہ سنہری زمانہ خداوند تعالےٰ نے اسی پاک اور نورانی مخلوق کو جس کا نام ہم نے فوق البشر رکھا ہے۔ عطا فرما رکھا ہے۔ مگر انسان اس سنہری زمانے سے محروم ہے۔ جو جذبات ہم میں پائے جاتے ہیں۔ فوق البشر میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ ان سب سے مستغنی ہیں۔ وہ صرف خالص ہوا پر ہی اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انکو غذا کی کوئی ضرورت نہیں ؛

ہماری قوتیں محدود پیدا کی گئی ہیں۔ ہم کسی کام کو بے تکان لگاتار محنت کرکے انجام تک نہیں پہنچا سکتے۔ ہم اپنی تمام طاقت صرف کرچکنے کے بعد چلنے پھرنے اور کام کرنے سے مجبور ہوجاتے ہیں ؛

ہم زیادہ دیر تک توجہ کی قوت سے کام نہیں لے سکتے۔ کیونکہ تھوڑے سے غور و خوض کے بعد وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ اور ہمارا خیال رُک جاتا ہے ؛

قصہ مختصر یہ ہماری مادہ سے بنی ہوئی گاڑی جسکو بہت خوبصورت بنایا گیا ہے۔ صدہا اقسام کی دشواریوں سے بھری ہوئی ہے۔ جن میں سے بعض کو لوگ بیماری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ان آفات سے بہشت کے رہنے والوں کو کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ انکو کام سے تھک کر آرام کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ہے ؛

اگر ہم یہ فرض کر لیں۔ کہ فوق البشر کی زندگی کا مدار صرف تنفس پر ہے۔ تو ہمکو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ ان کے جسم نہایت سادہ اور سبک بنے ہوئے ہیں۔ انسان و حیوانات کے جسم میں بہت کچھ پیچیدگیاں ہیں۔ اسیوجہ سے انکے اعضاء۔ حواس کو اپنی خواہش کے لئے یہ سب مصائب برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ چونکہ فوق البشر کا جسم بوجہ ان چیزوں کے نہ ہونے کے زیادہ ہلکا ہوگا۔ اسلیئے قوائے روحانی کے اظہار کے واسطے اس میں زیادہ موزونیت ہوگی ؛

یونتو انسان و حیوان کے جسم ہی کی بناوٹ کچھ کم عجیب و غریب نہیں ہوتی۔ مگر فوق البشر کی تو اور بھی حیرت خیز و شگفت خیز ہوگی ؛

چونکہ ان کا جسم نہایت سبک ہے۔ اس لئے فوق البشر نہایت سُرعت کیساتھ حرکت کرتے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا سکتے ہیں۔ خواہ انکا نام انسان ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ چشم زدن میں شرق سے غرب اور شمال سے جنوب کو آ جا سکتے ہیں ؛

فوق البشر نہ تو کھانے پینے کے محتاج ہیں۔ نہ انکو آرام۔ آسائش ہی کی ضرورت ہے وہ کیسی ہی محنت کریں۔ مگر نیند کے خواہشمند ہونگے ؛

مگر انسان تو اس حالت میں مجبور ہے۔ نیند آنے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جب اس کے جسمانی قوے کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ تو آرام لینے کی خاطر اسے اس مصنوعی اور عارضی موت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور جتنی دیر وہ سوتا رہتا ہے۔ اتنی دیر میں اسکی قوت کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ اور پھر آئندہ کے لئے وہ مستعد ہو جاتا ہے۔ فوق البشر کے قوائے اس قسم کے ہوتے ہیں۔ کہ نہ وہ تھکتے ہیں۔ اور نہ زائل ہوتے ہیں۔ اسیوجہ سے انکو خواب کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ ہمیشہ جاگتے رہنا۔ فوق البشر کی ایک دائمی حالت ہے۔ جو لوگ اچھر

(خالص ہوا) میں رہتے ہیں۔ وہ تاریکی کو بھی نہیں جانتے ہونگے۔ کیونکہ تاریکی اور رات دن کا وجود تو گردش ارضی سے ہے۔ بارہ گھنٹہ تک سورج چھپا رہتا ہے۔ اور اس حرکت سے کرہ ہوائی محیط الارض بھی چکر میں رہتا ہے۔ مگر کرہ ہوائی سے اوپر اسکا اثر مطلق نہیں ہوتا۔ اور ایتھر میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہوتی۔ فوق البشر پر بھی اس حرکت سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ہاں رات کا منظر سیاروں پر ضرور پڑتا ہے۔ کیونکہ انکا نصف کرہ آفتاب کے مقابل ہونے کی وجہ سے منور ہے۔ اور نصف پیچھے ہونے کی وجہ سے تیرہ وتار۔ مگر باقی کائنات میں کہیں رات نہیں ہوتی۔ اور چونکہ فوق البشر ان سیاروں سے علیحدہ اور زیادہ بلندی پر آباد ہیں۔ اسلئے ان پر انکا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور ان کا ہر وقت روشنی میں گذر ہوتا ہے ؛

گو فوق البشر میں بھی حواس ذہنی ہیں۔ جو ہم میں ہیں۔ لیکن اسمیں قوت احساس ہماری نسبت بہت تیز ہے ؛

اکثر حواس انمیں ایسے بھی ہونگے۔ جو ہم میں نہیں ہیں۔ مگر وہ کیا ہیں؟ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا محال ہے ؛

ایک مادرزاد نابینا رنگوں کے علم کو کیا جانے؟۔ اگر وہ سرخ رنگ کو اپنے تئیں سمجھانا چاہے تو سوائے اسکے کیا کہیگا۔ کہ ہاں مجھکو معلوم ہے۔ ایک مادرزاد بہرہ جسکو آواز کا خیال بھی نہ ہو کسی کی آواز کی تعریف میں یہی کہہ سکتا ہے۔ کہ بیشک وہ ہری ہری مخمل کی طرح ملائم ہے۔ لہذا ہم اس سوال کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اسکا جواب دینا یا اسپر بحث کرنا اپنے منصب کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہمکو معلوم نہیں۔ کہ ان میں کون کون سے حواس ہیں ؛

فوق البشر میں نئے نئے حواس اور اسیطرح اسکا نیا نیا علم وخیال بھی ہوتا ہوگا ؛

ہاں اتنا ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ حواس خمسہ میں نسبتاً زیادہ ہونگے۔ اور یہ نتیجہ حیوانات کے حواس پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ کتوں میں قوت شامہ کثرت استعمال سے بڑھ جاتی ہے۔ عقاب وغیرہ میں قوت باصرہ بہت قوی ہوتی ہے۔ امریکہ میں بعض قومیں ایسی بھی آباد ہیں۔ کہ وہ صرف کسی شخص کے نقش قدم کو دیکھکر کوسوں کے فاصلہ سے اسکی موجودگی کا علم حاصل کرلیتی ہیں۔ گویوں کی قوت سامعہ ایسی تیز ہوجاتی ہے۔ کہ انکو ذراسی بات کی بے ترتیبی ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر صدہا باجے بھی بج رہے ہوں۔ تو وہ ایک آواز کو دوسری آواز سے فوراً تمیز کرلیتے ہیں۔ پس اسیطرح فوق البشر بھی اپنی قوت احساس میں بہت کچھ بڑھے ہوئے ہونگے ؛

دیکھو سائنس اور فلسفہ وغیرہ علوم نے ہماری قوت حواس کو کسقدر قوی کر دیا ہے اسی سے ہم فوق البشر کی قوت حواس کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں ؛

کیا کوئی شخص خوردبین کی ایجاد سے پہلے یہ جانتا تھا۔ کہ ہم اپنی اس آنکھ سے دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی عجیب وغریب چیز کو بھی دیکھ سکینگے؟ ۔کون جانتا تھا۔ کہ پانی وغیرہ میں اسقدر چھوٹے چھوٹے ان گنت جانور آباد ہیں۔ حالانکہ یہ مخلوق کچھ آج ہی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ زمانہ قدیم سے اسیطرح چلی آتی ہے۔ اسکا علم حضرت انسان کو ہوتے ابھی پوری دو صدیاں بھی نہیں گذریں ۔ یہ سب کچھ دوربین ہی کے طفیل میں ہمیں نصیب ہوا ہے پس ہم سمجھ سکتے ہیں۔ کہ علم کی ترقی سے جب انسان کی نظر طبقات سماوی کی سیر کر سکتی ہے ۔ تو فوق البشر کے حواس جو ہماری نسبت کہیں زیادہ نشو ونما پاتے ہوتے ہیں۔ کیا کچھ دیکھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہونگے؟ ؛

اگر ہماری آنکھ میں وہ طاقت پیدا ہو جائے ۔ جو دوربین اور خوردبین کو حاصل ہے تو وہ علم جو اس وقت ہمکو حاصل ہوگا۔ اندازہ و احاطہ خیال سے باہر ہے ؛

آجکل سائنس کے عروج کا زمانہ ہے ۔ اگر خدا ہماری آنکھوں میں اسقدر ترقی عطا فرماتے۔ کہ ہم اجسام کے اجرام اور اندرونی تہوں کے حالات انکے ذرات نسبتی جسامت ترتیب ۔ اور ذروں کی صورت ورنگ وغیرہ کو دیکھ سکیں ؛

اسوقت ہمکو تمام راز ہائے قدرت معلوم ہو جائیں ۔ اور جس بات کو قدیم زمانے میں لوگ کرشمہ وکرامات بتاتے ہیں ۔ اسوقت وہ بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگیں ؛

خیر اس بحث سے جو انسان کی ذہنی ترقیات کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچتی ہے ۔ ہم اس سے نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ فوق البشر میں قوت باصرہ بہت زیادہ ہوگی ؛

اور اسیطرح ہم دوسرے حواسوں کی نسبت بھی قیاس کر سکتے ہیں کیونکہ انسان میں یہ صرف ابتدائی حالت میں ہیں۔ اور فوق البشر میں انتہائی و مکمل حالت میں اب سوال پیدا ہوتا ہے ۔ کہ کیا انمیں مرد وعورت اور تذکیر وتانیث کی بھی خصوصیت ہوگی؟ ؛

اسکے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ نہیں ۔ فوق البشر مخلوق تذکیر وتانیث کے بکھیڑے سے آزاد ہے ۔ ان میں عورت و مرد کی تخصیص نہیں ہے ؛

حیوانات کی نسبت بنی نوع انسان میں محبت زیادہ پاک ہوتی ہے حیوانات میں

مادہ الفت بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اسمیں صرف ایک مادی جذبہ ہے۔ جسکو لفظ نا محبت کہتے ہیں اسکے سوا اگر حیوانات میں کسی قدر محبت کا پتہ ملتا ہے۔ تو وہ کسی قدر ماں کو اپنے بچہ کیساتھ ہوتی ہے۔ مگر وہ بھی دیرپا نہیں ہوتی۔ غرض حیوانات میں تو سوائے مجامعت کی ضرورت کے اور دیرپا محبت ہوتی ہی نہیں۔ اب رہا انسان سو اسکی محبت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان کا یہاں ذکر کرنا بیسود ہے ؛

ہمکو اپنے والدین اور اپنی اولاد سے تا دم زیست محبت رہتی ہے۔ بھائی۔ بہن۔ عزیز و اقربا سے بھی محبت ہوتی ہے۔ یہ سب محبت روحانی ہوتی ہے۔ جو نفسانیت سے بالکل مبرا ہے۔ گو بعض اوقات جسمانی ضروریات کی وجہ سے بھی محبت ہوتی ہے۔ اگر ہم اس سے آزاد ہوکر بغیر ضمانۃ الغت بھی رکھتے ہیں۔ اس حالمیں ہم حیوانات سے افضل اور برتر ہیں ؛

اب آگے بڑھکر تیسرے درجہ پر پہنچیئے یعنی فوق البشر مخلوق کا خیال کیجیئے۔ ان کی محبت جنسیت کے لحاظ و خیال سے بھی مبرا ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک سی حالت میں رہتے ہیں۔ انکو محبت نفسانی سے کوئی واسطہ نہیں ہے ؛

اسی سوال پر ہم ایک اور پہلو سے نظر ڈالتے ہیں۔ خالص ہوا کا طبقہ وہ مقام ہے۔ جہاں وہ لوگ جنکو یہاں ایک دوسرے سے محبت و الفت تھی۔ جا کر ملتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ وہاں باپ اپنے بیٹے سے ماں اپنی بیٹی سے بھائی بھائی سے خاوند زوجہ سے دوست دوست سے ملینگے۔ جنکو اس دنیا میں ملک الموت کے زبردست ہاتھ نے جدا کر دیا تھا ؛

دُنیا کی محبت میں کچھہ خود غرضی کا جزو بھی ملا ہوا ہوتا ہے۔ دوستی۔ تنگ خیالی اور ظاہرداری کا خیال تھوڑا ہو یا زیادہ ضرور ہوتا ہے۔ اسلئے وہ آسانی سے بلا دقت بڑھ نہیں سکتی۔ اور نہ کل دُنیا کے واسطے عام طور سے اور بلا تحقیق وسعت ہی پا سکتی ہے اسلئے کہ ہماری محبت خلاق عالم کے عشق کے درجہ تک نہیں پہنچتی۔ اور ہم اُس پروردگار کو اپنے ہمسایہ کیطرح بھی پیار نہیں کرتے۔ مگر واں وہ محبت کی قوت جو جسمانی قیود تک محدود ہے۔ کل خلائق نفسانی سے علیحدہ اور آزاد ہو جائینگی۔ اور اسوقت ہم ایک آزاد انسان کیطرح اپنی بیوی کو بھی اپنے بچوں عزیزوں اور دوستوں کیطرح پیار کرینگے۔ جب خواہش ہائے نفسانی کا لوث اس پاک محبت سے بالکل دور ہو جائیگا۔ محبت غیر محدود ہو کر کل خلقت پر

یکساں ہوگی۔ اسکے دل میں سچی فیاضی کا جوش ہوگا۔ اور اپنے خالق کی محبت کو کل محبتوں پر فائق سمجھکر عبادت کی شکل میں اسکا اظہار کرتا رہیگا ؛

اب اعتراض ہوسکتا ہے کہ جب فوق البشر میں تذکیر و تانیث کی تخصیص ہی نہیں ہوتی۔ تو پھر ان میں سلسلہ تولید اور افزائش نسل کسطرح قائم ہے؟۔ اسکا جواب یہ ہے کہ افزائش نسل کیلئے فوق البشر تولید و تناسل کی قیود میں نہیں ہیں جسطرح وہ غذائیت و پرورش وغیرہ سے مستغنی ہیں۔ اسیطرح ان کے ذمہ ترقی نسل کا بھی بار نہیں ہے۔ یہ کام انسانوں اور دیگر سیاروں کے باشندوں کے ذمہ ہے۔ ہر قسم کے بیشمار انسان بستے ہیں۔ اور بالائی طبقہ صرف اعلےٰ اور مقدس لوگوں کا مسکن ہے جو تولید و تناسل کی قیود سے آزاد ہیں۔ ہمارا کام افزائش نسل کرنا ہے۔ اور فوق البشر کا کام وراثت ؛

مجھے سائنس کی ایک بیش قیمت کتاب میں جسے ڈاکٹر پارچیٹ صاحب نے لکھا ہے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُسمیں اُنھوں نے تحریر کیا ہے۔ عالم برزخ نامی کی رائے میں انسان صرف روح و مادہ کا مجموعہ ہے۔ برزخ صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ بعض اوقات مادہ مغلوب اور روح غالب ہوجاتی ہے۔ اور کبھی روح مغلوب اور مادہ غالب ؛

اگر ہم اس فلاسفر کے مذکورہ بالا مقولہ کو تسلیم کریں۔ اور انسان میں مادہ اور روح کے سوا اور پچاس کی نسبت مان لیں۔ تو اس حالت میں فوق البشر جو انسان سے بدرجہا افضل ہے کے اندر سو میں اسی یا پچھتر حصہ روح مان لینا بیجا یا نامناسب نہ ہوگا ؛

ہمکو یہ بات ضرور ماننی چاہیئے۔ کہ فوق البشر میں ہماری نسبت بہت زیادہ روح ہے ؛

فوق البشر کے حواس ہماری نسبت بہت زیادہ ہیں۔ اور کل حواس کا مدار روح پر ہے لہذا ماننا پڑتا ہے۔ کہ ان میں روح بھی ہماری نسبت بہت زیادہ ہی ہوگی ؛

چونکہ ہماری دنیاوی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ اسلئے ہماری روحانی قوت بھی کمزور ہے۔ اگر وہ زیادہ بھی ہوتی۔ تو اس مختصر سی زندگی میں تقریباً فضول تھی کیونکہ اسکی پرورش اور نشو و نما کے لئے کافی عرصہ درکار تھا۔ جو ہماری زندگی میں نہیں ہے ؛

مگر برخلاف اسکے فوق البشر کے سامنے یہ میدان کھلا ہوا ہے۔ اس دنیا میں ہر شئے بہت زیادہ اور دیرپا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوق البشر کی قوت ذہنی بہت دیرپا ہوگی ؛

فوق البشر میں اور نئی نئی قوتیں تو ہونگی ہی۔ مگر جو قوتیں اسکے ساتھ نیچے سے گئی ہیں

اور جو ہم لوگوں میں بھی ہیں۔ وہ اسمیں بدرجہ کمال ہونگی۔ مگر انکا علم ہمکو ہونا محال ہے ؏

ہمکو دُنیا کی تمام باتوں کا علم۔ توجہ خیال عقل علم ارادہ اور تمیز سے حاصل ہوا ہے۔ یہ باتیں فوق البشر میں زیادہ عمدگی اور کمالیت کے ساتھ ہونگی ؏

ایک فرانسیسی عالم جو طبایع انسانی کا کافی مطالعہ کرچکا تھا۔ لکھتا ہے کہ اس عالم میں قوت ممیزہ بہت کمزور ہے ہر دانا شخص اس مقولہ میں اس سے متفق ہوگا ؏

زیادہ تر لوگ جہالت باطل پرستی اور غیض و غضب میں منہمک ہیں۔ تمیز و ادراک اور عقل سلیم انسان کیلئے گوہر گرانمایہ سے کم نہیں۔ گو انسان میں یہ خصوصیت کم ہے۔ مگر فوق البشر میں اسکی کمی نہیں ہے۔ جو بات یہاں کبھی کسی میں شاذو نادر ہے وہ وہاں عام ہے ؏

ہماری کل قوتوں سے زیادہ قابل قدر اور قیمتی قوتیں دو ہیں۔ ایک ذہن دوسرے حافظہ انہیں پر کل علوم کی تحصیل کا مدار ہے۔ مگر دیکھو کہ ایسی نایاب چیزیں بھی ہمارے پاس کسقدر کمزور ہیں۔ ہم خود اپنی ہی زندگی کے واقعات یاد نہیں رکھ سکتے۔ بچپن کی کوئی بات بھی یاد نہیں رہتی ؏

ہمکو بالکل یاد نہیں رہتا کہ ہمکو بچپن کے زمانہ میں والدین نے کس ناز و نعم سے پرورش کیا تھا۔ بلکہ اگر کسی بچہ کی ماں اسکو خوردسالی میں چھوڑ کر مرجاتی ہے۔ تو وہ اسے قطعی بھول جاتا ہے۔ بڑے ہوکر وہ طفلی کے مدارج بھلا کس کو یاد رہ سکتے ہیں؟ ہم تو انکو ایسا بھول جاتے ہیں۔ گویا ہم کبھی بچہ ہوئے ہی نہ تھے ؏

بچہ تاوقتیکہ سال بھر کا نہیں ہوتا۔ اسمیں یادداشت کی قوت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور پھر جب وہ بوڑھا ہوجاتا ہے۔ تو وہ پیدا شدہ قوت مسلوب ہوجاتی ہے۔ اور ایک سالہ بچہ کی طرح اسے کچھ یاد نہیں رہتا ؏

پس یہ ہمکو پوری طرح یقین ہے کہ فوق البشر میں یہ قوت نسبتًا بہت زیادہ ہوگی ؏

علاوہ ازیں جب ہم بہت سے نئے واقعات دیکھیں اور عجیب و غریب مشاہدات کریں۔ تو ہمارا ذہن بہت کچھ ترقی پا جاتا ہے۔ جب روح اپنے ادھر ادھر وسیع دُنیا کو دیکھیگی تو اپنے ذہن میں اسکا جغرافیہ قائم کرلیگی۔ اسوقت اسکو ان گنت آبادیوں کے انقلاب کا علم ہوگا جیسے کہ اسکو یہ بھی معلوم ہوگا۔ کہ ان ستاروں اور انکے قمروں میں کیسی مخلوق بستی ہے؟ ہم تم جس طرح غیر ممالک کی سیر کو جایا آیا کرتے ہیں۔ اسی طرح فوق البشر مریخ و مشتری وغیرہ دوسرے کروں

کی سیر کو جایا کریگا۔ اور وہاں ہزاروں نئی نئی باتیں دیکھیگا۔ جنکو اسے یاد رکھنا پڑیگا۔ سوچیال
کرلو۔ کہ فوق البشر کے قوائے ذہنی کیسے تیز ہونگے۔ اور اُسکا حافظہ کتنا بڑھا ہوا ہوگا ؛

اظہار خیالات کا ذریعہ زبان ہے۔ بقول کنڈارسٹ فلسفی ہمکے سائنس اپنے تئیں صرف
مکمل زبان ہی میں قایم رکھ سکتا ہے ؛

پس کرہ ہائے سیارگان کی مروجہ مستعملہ زبان بھی مکمل ہوگی۔ اسلئے کہ انکا علم نہایت
وسیع اور اعلےٰ ہے۔ اچھا ذہن جسقدر واقعات سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ اُسیقدر اُسکے اظہار
میں صراحت و آسانی حاصل ہوتی جاتی ہے ؛

فوق البشر کی زبان سلیس اور علم بے پایان ہوگا۔ بڑے بڑے عقلمند اُسکے نزدیک طفل
مکتب ہونگے۔ کوئی سائنس ایسا نہ ہوگا۔ جسے وہ نہ جانتے ہوں۔ اور کوئی اخلاقی خیال ایسا نہوگا
جو انکی نظر سے بعید ہو۔ ہماری اس غریب زمین کی ان کی نظروں میں کیا وقعت ہو سکتی ہے؟
جبکہ وہ ہماری اور اپنی وجہ حدوث یعنی انسان اور فوق البشر کس لئے پیدا ہوئے؟ کیوں اس دنیا
میں آئے؟ کب اس دنیا میں آئے؟ کہاں سے آئے؟ کہاں کو جائینگے؟ جانتے ہیں؟ جن باتوں سے
ہم لوگ ناواقف محض ہیں ؛

وہ مقصد الٰہی سے آگاہ ہونگے۔ سر غیب کو جانتے ہونگے۔ انکو اسکے ظاہری اُمور کے
رازہائے باطنی معلوم ہونگے۔ جنکو ہم لوگ اپنی بے علمی کی وجہ سے خدا کی جانب بیرحمی اور بے
انصافی کیساتھ منسوب کردیا کرتے ہیں۔ انکو بخوبی معلوم ہوگا۔ کہ خداوند تعالےٰ منصف اور رحیم ہے ؛

ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ باشندگان ہوائے خالص اوقات کی پابندی سے بھی آزاد
ہیں ہم یقین کرتے ہیں۔ کہ خداوند تعالیٰ کیلئے وقت کوئی چیز نہیں۔ اور چونکہ باشندگان ایتھر بلحاظ
روحانیت خدا سے قرب رکھتے ہیں۔ اسلئے وہ بھی قیود اوقات سے بچے ہوئے ہیں ؛

یہ ہمکو معلوم ہے کہ زبردست صدمہ اوقات کے قیود کو توڑ دیتا ہے۔ مثلاً کسی عزیز کا
رنج خواہ کتنا زمانہ کیوں نہ گذر جائے۔ اسی طرح قایم رہتا ہے۔ جیسا کہ مرنے کیوقت تھا ؛

انسان کیواسطے وقت سے بہتر دنیا میں کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وقت دولت سے بہت
زیادہ قیمتی بتایا گیا ہے۔ مگر فوق البشر یقیناً اسکی قیود سے بھی آزاد ہیں۔ انکی زندگی میں اس کا
کوئی شمار نہیں۔ وہ گو اپنے عزیزوں کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر اس انتظار میں بیصبری اور گھبراہٹ
نہیں ہوتی۔ عزیزوں سے ملتے ہیں۔ چونکہ فوق البشر قیود اوقات سے آزاد ہے۔ اسلئے وہ نہایت

اطمینان کہ با ہمداں تمام عجیب و غریب مناظر کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ جو اس گردش ارضی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں ؛

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ روح انسانی قالب سے نکلکر ایک نیا قالب اختیار کرتی۔ اور طبقہ ہوائے خالص پر جا رہتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نیا جسم بھی کچھ زمانہ گذرنے کے بعد انسانی جسم کی طرح تحلیل ہو کر مادہ کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور کیا فوق البشر کی زندگی بھی ختم ہوگی؟ ؛

اس سوال کا جواب ہم اثبات میں دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ بیشک یہ تمام باتیں ہونگی۔ زندگی بلحاظ اسباب کی شاہد ہے۔ کہ اسکو کبھی نہ کبھی موت ضرور آئیگی۔ موت و زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر فوق البشر کی روح زندہ جسم میں رہتی ہے۔ تو کبھی نہ کبھی یہ جسم ضرور مریگا۔ اور اسکا مادہ اسی قدرت کے خزانہ میں ملجائیگا جس میں ایک دفعہ پہلے مل چکا ہے۔ اور جس سے نکلا تھا۔ اہل دنیا کی طرح طبقہ بالا کے ساکنین میں بھی مرگ و زیست کا بازار گرم ہے ؛

فوق البشر بھی ہماری طرح فنا ہوتے ہیں۔ مگر ان کی موت کا زمانہ غیر محدود ہے ؛

مگر یہ سوال کہ پھر اس روح کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اور وہ کہاں جاتی یا کیا کرتی ہے؟۔ مضمون زیر بحث سے علیحدہ ہے۔ لہذا اسکے لئے ہم علیحدہ باب قایم کرتے۔ اور اسمیں اسکا مفصل جواب دیتے ہیں ؛

فصل ششم

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہماری دنیا میں نباتات سے لیکر انسان تک کے مدارج و مراتب قایم ہیں۔ اس سلسلہ کو پہلے کائی سے جو ترکیب نباتاتی کی تمہید ہے۔ شروع کرو۔ پھر آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے درختوں سے گذر کر بڑے بڑے درختوں تک پہنچو۔ اسکے بعد زوفائیٹ اور مونگا جانوروں کو لو۔ جو عجیب الخلقت ہیں۔ جن میں حیوانی اور نباتاتی ہر دو خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس سے آگے بڑھکر آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے حیوانات تک پہنچو۔ اور وہاں سے انسانوں کے درجہ تک پہنچ جاؤ۔ پس یہ ایک طویل زنجیر ہے جسکی کڑیاں مسلسل اور مربوط ہیں۔ اس تبدیلی کو نہایت خوشنمائی اور نفاست سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ ایک سرا تو اسکا کائی ہے۔ اور دوسرا سرا انسان۔ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں صدہا درخت اور جانور ہیں ؛

مگر حیرت ہے کہ اس ترقی بالمدارج کے اصول کو دیکھتے ہوئے بھی ہم لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہ بس اب ہمارے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان کوئی درجہ اور مرتبہ باقی نہیں رہا اور اب یہاں سے خداوند تعالیٰ تک خدا ہی خدا ہے۔ کیا اچھی عقل ہے۔ کہ کائی سے لیکر انسان تک تو ہم جانتے ہیں۔ کہ صدہا مدارج ہیں۔ مگر اپنے سے خداوند تعالیٰ تک ایک ہی میدان تصور کریں۔ یہ سراسر غلطی اور بیہودگی ہے۔ اور اگر کوئی علم یا مذہب اس قسم کی غلط تعلیم دیتا ہے۔ تو اسکی ناواقفیت پر دال ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کہ نباتات وحیوانات وانسان میں تو تدریج ومراتب ہوں۔ مگر انسان اور خدا کے درمیان نہوں۔ اگر ہم اسبات کو مان لیں۔ تو انسان درجہ الوہیت تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اس سے اس کی شان وشوکت بڑھ جاتی ہے ؎

بس ہمکو ماننا چاہیئے۔ کہ ہمارے اور خدا کے درمیان اس قسم کے بہت سے وجود موجود ہیں۔ گو وہ نظر نہیں آتے ؎

اور اگر ہم کہیں کہ جو چیز نظر نہیں آتی۔ اسکا ثبوت کیا ہے۔ تو اسکی تردید چنداں مشکل نہیں۔ علم خواص الاشیاء کا ماہر پانی کا ایک قطرہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ یہ قطرہ پہلے بالکل صاف نظر آتا تھا۔ اور کوئی چیز اسمیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ مگر خوردبین سے ہزاروں ذی روح کیڑے اسمیں نظر آنے لگے۔ پانی کا قطرہ کیا ہے۔ ایک خاصی دنیا ہے جسمیں ہماری دنیا کیطرح اچھا خاصہ تولید وتناسل کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر کسی ناواقف سے یہ بات کہی جائے۔ تو کیا وہ یقین کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ کہنے والے کو الٹا بیوقوف بنانے لگے۔ مگر خوردبین سے دیکھنے کے بعد اس کلام کی صداقت کا اعتراف کرنا اس کے لئے ایک یقینی امر ہے ؎

غرض صرف اسی شے کو ماننا جو برہنہ آنکھ کو دکھائی دے۔ غلطی ہے ؎

اب ہم ایک خواص الاشیاء کے عالم کیطرح یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ گو فلسفہ یا مذہب انسان اور خدا کے درمیان خلا سمجھتا ہے۔ مگر روحانی نظر یعنی عقل۔ تمیز اور علم سے وہ مخلوق جو ہمارے اور خدا کے درمیان بستی ہے۔ اچھی طرح دیکھی جاسکتی ہے ؎

فوق البشر مخلوق کا بیان کرنے سے گو ہم نے انکے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان گویا ایک زینہ قائم کردیا ہے۔ مگر نردبان حقیقی کیلئے صرف ایک زینہ کافی نہیں ہوسکتا ؎

ہم لکھ چکے ہیں کہ فوق البشر مخلوق فانی ہے۔ مگر مرنے کے بعد انکا کیا حال ہوتا ہے؟۔ اسکا جواب آگے چل کر دیا جاتا ہے ؎

جب فوق البشر کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ جسکی مدت بہت زیادہ ہے۔ تو انکی روح جدید حواس کے استعمال سے مکمل ہو کر نئے قالب میں داخل ہوتی ہے۔ اسوقت انکے حواس پہلے سے بھی کہیں تیز ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی زندگی اپنے دایرہ میں پھر از سر نو شروع ہوتی ہے ؛

انسان سے بعد میں آنیوالی شخصیت کو ہمنے فوق البشر کے نام سے نامزد کیا ہے۔ اب ہم فوق البشر کے بعد آنے والوں کو فوق الملاک کہینگے ؛

ایک زندگی کو ترک کرنے کے بعد دوسری زندگی میں داخل ہونا اخلاقی اور جسمانی تکالیف کا باعث ہوتا ہے۔ جیساکہ انسان کی حالت سے ظاہر ہے۔ ہر قسم کی تبدیلی کے وقت درد اور تکالیف دو ضروری چیزیں ہیں ؛

ہم اس گروہ یعنی فوق الملایک کی ترکیب جسمانی پر بحث کرنا اپنے منصب کے خلاف سمجھتے ہیں ؛

فوق البشر کی زندگی جسم اور روح پر بحث کرنے کی تو یہ وجہ تھی۔ کہ جنس انسان کی مشابہت نے ہمیں قیاسی رائے قایم کرنے کا موقعہ دیا۔ لیکن فوق الملایک کے جسم روح اور زندگی وغیرہ میں ہمارا قیاس و خیال دخل دینے سے قاصر ہے ؛

بدیں وجہ ہم انکے جسم وغیرہ کی بابت کوئی رائے قایم نہیں کر سکتے۔ اور نہ انکے حواس ہی قایم کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ انسانی جسم سے جو روح ابتدا میں نکلی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ ان منزلوں میں مکمل ہوتی جائیگی۔ یہ بات کہ راہ میں اور کتنی منزلیں آئینگی؟ ہمکو بالکل معلوم نہیں۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ تعداد میں باکثرت ہونگی ؛

اور ہر ایک منزل یا درجہ پر قوت فہم و ادراک روحوں میں ترقی پاتے جائینگے ؛ معرفت علم الہٰی بڑھتی جائینگی۔ محبت روز افزوں ترقی کرتی رہیگی۔ اور ہر بار مرنے کی تکلیف کے عوض میں اسکو نئی خوشیاں حاصل ہونگی ؛

مگر یہ دنیا کسی شے کے لئے دار القرار نہیں ہے۔ آخر کار کبھی کبھی ان طبقات کے دور ارواح سفر طے کرنے کے یہ خاص مقام مقصود پر پہنچ جائے گی ؛

مگر وہ مقام مقصود کونسی جگہ ہوگا؟ اسکا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ آفتاب میں ہوگا۔

فصل ہفتم

ہمارا قیاس یہ ہے کہ آفتاب ایک متوسط مقام ہے۔ جسکے اندر وہ ارواح جو ہمارے

خلاء کے طبقہ سے آتی ہیں۔ آباد ہوتی ہیں ؛

اس جگہ علم طبعی و علم ہیئت کے طریق پر آفتاب عالمتاب کا مختصر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ؛

واضح ہو کہ تمام سیاروں میں سورج ایسا ہی ممتاز ہے۔ جیسا عوام الناس میں ایک بادشاہ ہوتا ہے۔ کل نظام شمسی میں کوئی کرہ اسکا ہمسر نہیں۔ اور اسکو وہ حیرت خیز و شگفتا انگیز طاقت حاصل ہے جس کا تحریر میں لانا محال ہے ؛

جاننا چاہیئے کہ آفتاب کائنات عالم کے تمام سیاروں سے مختلف ہے۔ اور وہ کسی شے سے متشابہ اور ملتا جلتا ہوا نہیں ہے۔ اسکی عظیم جسامت اور ترکیب طبعی اور اس کی خصوصیات ان خیالات کی جو اسکو کل سیاروں کا بادشاہ بناتے ہیں۔ تصدیق کرتی ہیں۔ سورج کی عظیم جسامت اسکے اعلےٰ رتبہ پر دال ہے۔ اسکے اندر وہ تمام چیزیں جو دوسرے کروں سے آتی ہیں۔ بخوبی سما سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ کل سیاروں کے مجموعہ سے بھی چھ سو گنا بڑا ہے۔ اور ہماری زمین کی تو اسکے مقابلہ میں گویا کوئی ہستی ہی نہیں ہے ؛

اگر ہم براہ سمندر جہاز میں بیٹھکر دنیا کے چاروں طرف سفر کریں۔ تو تین سال میں جہاں سے چلے تھے۔ پھر وہیں آ جائینگے۔ لیکن اگر ہم اسی طرح آفتاب کے گرد پھرنا چاہیں۔ تو کہیں تین سو برس میں جاکر اس دورہ کو تمام کرینگے ؛

زمین کی نسبت سورج وزن میں بھی تیس گنا زیادہ ہوگا۔ زمین پر گرنے والی چیز ایک سکنڈ میں چار میٹر اور نوسنٹی میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ مگر سورج میں گرنے والی چیز ایک سکنڈ میں ایکسو چوالیس میٹر فاصلہ طے کریگی ؛

سورج میں قدرت کی کیفیت بھی زمین کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے ؛

سورج ہمیشہ شعاعوں کی بارش کرتا رہتا ہے۔ یہ بات اور کونسے سیارہ میں ہے؟ وہ خود تو جلتا ہے۔ مگر دوسروں کو روشنی بخشتا ہے۔ سورج کے سوا اور کوئی ستارہ گرم و درخشاں نہیں ہے۔ اگر آفتاب نہ ہوتا۔ تو دنیا میں ایک اندھیرا ہوتا۔ اور اسقدر سردی ہوتی۔ کہ زندگی ناممکن تھی بس اسی سے ہم سورج کی عظمت اور فائدہ مندی معلوم کر سکتے ہیں ؛

آفتاب کی اصلی حرارت کی مقدار کا اندازہ بھی ماہران علم خواص الاشیاء نے لگایا ہے۔ فرانسیسی عالم پولٹ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ اگر حرارت آفتاب کو سطح برف پگھلانے میں

کام میں لائیں۔ تو یہ ایک منٹ میں برف کی گیارہ میٹر اسی سنٹی میٹر موٹی تہ کو پگھلا سکتی ہے۔ اور ایک روز میں سترہ کیلومیٹر کی موٹی تہ کو۔ پروفیسر ٹنڈل صاحب لکھتے ہیں۔ کہ حرارت آفتاب دس کروڑ مکعب کلومیٹر کے پانی کو جو برف کی حالت میں یعنی منجمد ہو۔ کھولنے کے درجہ تک پہنچا سکتی ہے۔ اور ہرشل صاحب ہیئت دان کا قول ہے کہ آفتابی حرارت کے روکنے کیلئے پانی کی منجمد دھار کو جسکا قطر ۴۵ میل اور جسکی رفتار ۲ لاکھ ۱۰ ہزار میل فی سکنڈ ہو۔ اگر جاری کیا جائے۔ تو اسکی خارج ہونیوالی حرارت کی رو کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے ؛

پروفیسر ٹنڈل صاحب فرماتے ہیں۔ کہ فرض کرو آفتاب کے گرد اکیس میل۔ ٹی ایندھن کی تہ ہے۔ جسقدر گرمی اس سے نکل سکتی ہے۔ اتنی گرمی آفتاب سے ایک سال میں نکل جاتی ہے ؛

جو تجربہ بوگر صاحب نے سنہ [illegible] میں کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوگیا ہے۔ کہ اس شمع کی نسبت جو ۳۹۔ انچ کے دائرہ میں ہو۔ آفتاب کی روشنی سمت الراس پر ۵۲۰۰۷ گنی زیادہ ہے۔ اور ولسٹن صاحب کے تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ۳۹۔ انچ کی شمع کی روشنی کے برابر آفتاب ایک سکنڈ میں روشنی دیتا ہے ؛

سمت الراس پر آنے کے وقت آفتاب کی برقی قوت ۹۰۰۰۶ شمع کے برابر ہوتی ہے بوگر صاحب کے تجربہ میں اور اسمیں بہت تھوڑا فرق ہے ؛

اب ہمارے پاس ایسے سامان موجود ہوگئے ہیں۔ کہ ہم سورج کے برابر روشنی پیدا کرسکتے ہیں۔ ہائڈروجن گیس کو آکسیجن گیس کی یا ہوا کی امداد سے جلانے سے نہایت تیز روشنی پیدا کیجاسکتی ہے۔ لنڈن اور پیرس میں اس روشنی کا عام رواج ہے ؛

اس روشنی سے قطع نظر آفتاب میں اور بھی خصوصیات ہیں۔ کل سیارے اور انکے قمر اور تمام دمدار ستارے آفتاب کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ اور آفتاب ان تمام سیاروں کے بیچ میں ساکت ہے ؛

بعض جاہل اس مقام پر کہنے لگتے ہیں۔ کہ آفتاب کل جمیع سیارگان سے چھ سو گنا بڑا ہے پس ستاروں و سیاروں کے اس منظر کی تشریح قانون کشش کی وجہ سے ہوتی ہے ؛

مگر یہ غلط رائے ہے۔ نیوٹن صاحب نے جب یہ رائے ظاہر کی تھی۔ تو کہدیا تھا کہ یہ بیان کے قابل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کل اجسام اپنی اپنی جسامت کے موافق ایک دوسرے کی جانب جاتے ہیں۔ مگر یہ بات کہ وہ کیوں ایک دوسرے کی طرف جاتے ہیں ہماری عقل سے باہر ہے۔ ورنہ ہم کبھی اسکو جان سکتے ہیں جس امر کو ہم کشش کہتے ہیں۔ اسکو محبت ہمدردی اور فرمانبرداری بھی کہہ سکتے ہیں ؛

وہ اصلی سبب جس سے ہر ایک چھوٹا ستارہ بڑے ستارہ کے گرد گھومتا ہے انسانی عقل کے لئے ایک معمہ لاینحل ہے ؀

بس اب اسکی توضیح میں سوائے اسکے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ سیارے اور ستارے جو قمر اور مدار ستارے جو ہمکو نظر آتے ہیں۔ آفتاب کے ماتحت ہیں۔ اور سورج ان پر حکومت کرتا ہے اور اس کی حکومت ہی کی مطابقت میں یہ سب اسکے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ اور روشنی گرمی اور برق کی قوت اسی کی شعاعوں سے حاصل کرتے ہیں جو زندگی کے اصل اصول اور رکن اوّل ہیں۔ آفتاب ہی کی وجہ سے راتدن۔ موسم اور آب و ہوا کا انتظام ہوتا ہے۔ اور وہی ستاروں کو راستہ بتاتا ہے ؀

پہلے ان باتوں سے لوگ ناواقف تھے۔ اب جبکہ سائنس نے اسقدر ترقی کی ہے تو سائنس والوں نے اسکا پتہ لگایا ہے۔ کہ آفتاب ہی تقریبًا تمام مناظر کا سبب ہے۔ اگر آفتاب نہو تو یہ زمین اور سیارے سب بیکار محض ہیں ؀

اب ہم یہ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ زمین اور سیاروں کی تمام چیزیں سورج ہی کے چشمہ فیض سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ نباتات حیوانات اور انسان سب سورج ہی کی اولاد ہیں سب اسی سے پیدا ہوئے۔ اور اسی کی کرنوں میں گتھے ہوئے ہیں۔ ہوا۔ پانی۔ زمین غرضیکہ جو کچھ بھی نظر آتے ہیں سب سورج ہی کی وجہ سے ہیں۔ زندگی سورج ہی کے صدقہ میں ہے ؀

ہوا جو سطح زمین پر سب سے زیادہ کارآمد چیز ہے۔ سورج ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے سورج زمین کے بعض حصص کو گرم کرتا ہے۔ اور بعض کو سرد۔ مگر جہاں سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں وہاں کی ہوا تو لطیف ہوکر بلند ہوتی ہے۔ اور دوسرے حصوں کی سرد ہوا اسی مقام میں چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے موسمی ہوائیں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ دونوں کروں کے ادھر اُدھر ہوا کی دو دھاریں بہتی رہتی ہیں۔ اور خط استوا کی جانب سے قطبین کی طرف جاتی ہیں۔ اوپر کی دھار تو شمال مشرق کی جانب نصف کرہ شمالی میں جاتی ہے۔ اور نیچے کی دھار جنوب مغرب کیطرف نصف کرہ جنوبی میں بہتی ہے

جب آفتاب اُفق سے چلتا ہے۔ تو زمین سے گرم ہوا کی بجائے سرد جھونکے آتے ہیں اور صبح کے وقت اس کے برخلاف معاملہ ظہور پذیر ہوتا ہے ؀

سمندر کے کنارہ کی گرم ہوا تو بلند ہو جاتی ہے۔ اور سمندر کی سرد ہوا اسکی جانشین بنکر زمین کی طرف چلتی ہے۔ مگر شام کو اسکے خلاف ہوتا ہے یعنی اگر صبح کو سمندر کی طرف سے ہوا آتی ہے۔ تو شام کو زمین کی جانب سے آتی ہے۔ بس یہ ہوا کی تمام حرکت و سکون آفتاب کے طلوع و غروب کے

نتائج ہیں۔ چونکہ تمام سال آفتاب کا مقام ہر وقت اور ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ اسلئے ہوا میں بھی تھوڑی بہت ابتری پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

مینہ بھی جو ذی حیوانوں کی زندگی کا خاص سبب ہے۔ آفتاب ہی کی حرارت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے۔ کہ سورج کی گرمی سے سمندر، دریا، جھیل وغیرہ کا پانی اور وہ رطوبت جو نباتات میں جذب ہو جاتی ہے۔ بھاپ و بخارات کی شکل میں بنکر زمین سے بلند ہو کر رطوبت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ تو یہ بخارات ہوا سیال میں مل جل کر سرد ہو جاتے ہیں اور رات میں کہر یا بارش بنکر زمین پر برستے ہیں۔

اور جب یہ ابخرات آب کرہ باد میں بکثرت جمع ہو جائیں۔ تو بجائے رقیق ہونے کے منجمد ہو کر برف کی شکل میں برستے ہیں۔ یہ برف زیادہ تر پہاڑوں کی چوٹیوں پر گرتی ہے۔ اس لئے کہ بلندی کی وجہ سے وہاں سردی بکثرت ہوتی ہے۔ اور بلندی پر جب برف کو پڑے پڑے کچھ عرصہ ہو جاتا ہے۔ تو وہ ایک اور ہی درمیانی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جسکو لوگ برف کے تختے کہا کرتے ہیں۔ موسم گرما میں تمازت آفتاب کی وجہ سے آہستہ آہستہ برف پگھلنا شروع ہوتی ہے۔ اور اسکا پانی بہہ بنکر وادیوں میں گرتا ہے جس سے چشمے دریا اور نالے وغیرہ لبریز ہو کر بہتے ہیں۔ پھر بھی چشمے اور دریا اور ندی نالے سمندر میں گرتے ہیں۔ اور پھر تمازت آفتاب سے غیر محسوس ابخرات کی شکل میں صعود کرتے اور بادل بنتے ہیں۔

یہ پانی کی گردش جس سے گویا کرہ ارض صاف کیا جاتا ہے۔ صرف آفتاب ہی کیوجہ سے ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر شخص کو معلوم ہے۔ کہ ہماری زندگی میں بارش کیسی ضروری اور کارآمد چیز ہے۔

چونکہ آفتاب طاقتِ قدرت کا ایک خاص آلہ ہے۔ اسلئے نتائج کیمیائی میں اس کا خاص اثر پڑتا رہتا ہے۔

اگر آفتاب نہ ہوتا۔ تو کچھ عجب نہیں کہ یہ زندگی بھی نہ ہوتی۔ گویا آفتاب باپ اور زندگی اسکی اولاد ہے۔ جسکا اصول آئندہ بیان کیا جائیگا۔

علم فوٹوگرافی سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ کہ آفتاب کل نباتات کے کیمیائی عمل کا سبب اوّل ہے۔

روشنی شمسی میں ایک یہ بھی صفت ہے کہ مختلف اور متعدد اجسام کو ملا کر ایک کر دیتی ہے ہائیڈروجن اور کلورک گیس کو مساوی حصوں میں لیکر اور ایک بوتل میں بھر کر تم آفتاب کے سامنے

رکھدو۔ اسیوقت یہ دونوں ملکر کلورو ہائیڈرو ایسڈ گیس پیدا کریگی۔ اور یہ اس زور سے آمیزش ہوگی۔ کہ اسمیں سے بہت سی گرمی کی مقدار نکل بھی جائیگی ؛

اور اگر تم اس بوتل کو جسمیں یہ گیس بھری ہے۔ اوپر کی طرف ہوا میں اُچھال دو۔ تو قبل ازیں کہ وہ زمین پر گرے۔ بوتل ٹوٹ جائیگی۔ اور نہایت زور کے ساتھ دھماکہ کی آواز ہوگی ؛

اسیطرح مثال کیلئے ہزاروں کیمیائی کارروائیاں پیش کیجا سکتی ہیں۔ مگر اسیقدر اچھی طرح سمجھ لینا کافی ہے۔ کیونکہ ان باتوں کے ظاہر کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ آفتاب معاملات کیمیائی میں کس طرح اثر ڈالتا ہے ؛

یہ تو صرف معدنیات کا بیان کیا گیا ہے۔ اگر نباتات پر غور کرو تو معلوم ہو کہ آفتاب کا اثر ان پر اور بھی زیادہ پڑتا ہے ؛

آجکل جو سائنس کی عجیب و غریب تحقیقات ہوتی ہے۔ اسمیں سب سے زیادہ نباتات کے سانس لینے کا واقعہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اسکا بھی دارومدار بھی آفتاب ہی کی روشنی پر ہے یعنی کاربونک ایسڈ سورج ہی کی وجہ سے جبتک وہ رہتا ہے۔ بنتا ہے۔ اور اسے درخت اپنی جڑوں کی طرف جذب کرتے ہیں۔ اور وہی کل نباتات کی رگ رگ میں جاری ہے۔ جب نباتات سانس لیتی ہے۔ تو آکسیجن گیس کو خارج کر دیتی۔ اور اسکے عوض میں کاربن کو لے لیتی ہے ؛

ہر قسم کی نباتات کل عالم میں سانس لیتی رہتی ہے۔ بلکہ معدنیات تک سانس لیتی ہیں۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ حیوانات اور معدنیات آکسیجن کو جذب کرتی ہیں۔ اور نباتات آکسیجن خارج کرتی اور صرف کاربن کو جذب کرتی ہے۔ اسطرح نباتات گویا آکسیجن کے قایم رکھنے کا ایک مستقل آلہ ہے ؛

اگر سورج کی روشنی جاتی رہے۔ تو آکسیجن بھی فنا ہو جائے۔ یہ تو ناظرین کو معلوم ہی ہوگا۔ کہ سورج گرہن کے وقت ایک ذرا ہی عارضی طور سے روشنی کم ہوتی ہے۔ تو آکسیجن کی کمی سے دم گھٹنے لگتا ہے ؛

ایم بوسنگا صاحب رقمطراز ہیں۔ کہ " جن نباتات کو روشنی نہیں ملتی۔ وہ آکسیجن کو خارج نہیں کرتے صرف کاربونک ایسڈ گیس ہی میں سانس لیتے اور اسکو خارج کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بجائے سبز ہونے کے وہ سفید ہو جاتے ہیں " اس مقام پر یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ جن درختوں کو اندھیرے میں رکھا جاتا ہے۔ وہ اپنی غذا صرف بیجوں کے ذریعہ سے بہم پہنچاتے ہیں۔ اور

یا ہر سے مدد لینے میں عاری ہوتے ہیں صرف اسیقدر سرمایہ پر جو انکے تخم میں موجود ہوتا ہے اپنی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ سرمایہ تمام و کمال صرف ہو جاتا ہے۔ تو انکی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور درخت مرجھا کر سوکھ جاتا ہے۔ گویا اس قسم کے درخت کی مدت حیات صرف تخم کی مقدار پر ہے۔ اگر اچھا بھلا اگا ہوا پودا بھی کچھ عرصہ سایہ میں رکھا جائے۔ تو اسکا بھی یہی انجام ہوگا۔ صرف کاربونک ایسڈ ہی اس سے خارج ہوگی ؛

بقول ایم سیکس صاحب عالم تاریکی میں درخت مدام سوتے رہتے ہیں۔ اور انکے برگ و بار کو مناسب حرکت نہیں ہوتی ؛

جرمنی کے ایک سائنس داں مسٹر موسچاٹ کا بیان ہے کہ پتے اور پھل اور پھول کو صرف روشنی اور ہوا ہی نے باہمی امتزاج سے بنایا ہے۔ سائنس داں مذکور ایک دوسری جگہ پر لکھتا ہے کہ اگر ہم خوشنما اور خوشبودار پھولوں کے رنگ و بو کو بنظر غور دیکھتے ہیں جنکی خوشنمائی اور خوشبو مشعر اسکے دماغ کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔ تو ہمکو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ان سب خوشنمائیوں اور خوشبوؤں کی ماں ایک روشنی ہے ؛

روئیدگی پر آفتاب کا اثر عظیم الشان ہے۔ مادر گیتی یہانتک کہ خورشید جہانتاب کی نظر عنایت نہو۔ وہ ایک پودا بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ مثلاً سرد ممالک میں جہاں آفتاب کی روشنی نہیں پڑتی۔ وہاں ایک بھی درخت نہیں ہوتا۔ جبکہ دوسری طرف گرم ممالک گوناگوں روئیدگی سے مالامال ہیں ؛

اس مضمون کو ختم کرنے کے قبل ہم اتنا اور لکھے دیتے ہیں کہ آفتاب کی کیمیائی قوت سے اس زمانے کی نسلیں گذشتہ نسلوں سے نسبتاً زیادہ فایدہ حاصل کر رہی ہیں۔ مدتوں سے جو ذخیرے دبے پڑے تھے۔ وہ اب نکالے اور کام میں لائے جا رہے ہیں ؛

مثلاً کوئلہ جس سے اہل جہاز اور ریلوے والے وخانی کارخانے چلتے اور بنی نوع انسان کو طرح طرح کے فایدے پہنچتے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے ؟ ؛

سائنس بتاتی ہے کہ اگلے زمانہ میں جو گھنے درخت اور بن کھڑے تھے۔ وہ جلکر اس صورت میں بدلگئے۔ اور زمین کے اندر دب کر امتداد زمانہ سے ٹھوس ہوتے چلے گئے۔ اور انجام کار اسقدر وزنی صورت اختیار کر لی جنکو اس زمانہ میں پتھر کا کوئلہ کہنے لگے ؛

مگر یہ کیوں اس طرح کے ہو گئے۔ اور کوئلہ کی شکل کس طرح اختیار کی۔ فی الواقع یہ سوچ کی

کیمیائی قوت تھی جس سے یہ لکڑی جمع ہوکر محفوظیت کی حالت میں آگئی۔ اور آج ہم اسی کے ذریعہ سے یہ فیض حاصل کر رہے ہیں ؛

سورج کی حرارت کا نباتات وجمادات وغیرہ کی طرح حیوانات پر بھی عجیب اثر پڑتا ہے چونکہ نباتات۔ حیوانات کی غذا ہیں۔ اس لئے خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ پہلے نباتات ہی پیدا ہوئے ہونگے۔ اسکے بعد جاکر کہیں حیوانات کا نمبر آیا ہوگا ؛

اور اگر اب بھی عالم سے روئیدگی ناپید ہو جائے۔ تو لامحالہ حیوانات کو بموت مرنا پڑے اسلئے ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ آفتاب جس طرح نباتات کی زندگی کا موجب ہے۔ اسیطرح حیوانات کی زندگی بھی اسی کے دم قدم سے قائم ہے ؛

زندگی کے ساتھ ہی انسان وحیوان کی تندرستی کے لئے بھی آفتاب ضروری شے ہے۔ تم اگر ان لوگوں کی حالت کا جو کھلے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے جو بند مکانوں میں زندگی گذارتے ہیں۔ مقابلہ کرو۔ تو اس قول کی پوری تصدیق ہو جائے ؛

یہ بات کہ آفتاب کی شعاعیں انسانی زندگی کے لئے بیحد مفید ہیں۔ پروفیسر ٹنڈل صاحب کی مفصلہ ذیل تحریر سے بخوبی ذہن نشین ہو جائیگی ؛

جیساکہ وہ طاقت، جو گھڑی کی سوئیاں چلانے کا باعث ہے۔ انسان کے ہاتھ سے حاصل ہوتی ہے۔ اسیطرح تمام زمین کی طاقت کا مرکز سورج کے اندر ہے۔ اسی کی حرارت سے سمندر کا پانی رقیق ہوتا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہوا کی گیس بنتی ہے۔ وہی طوفان اٹھاتی ہے پہاڑوں پر اسی کے دم قدم سے برف کے تودے لگ جاتے ہیں بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج اسی کی مغلوب کرنیوالی طاقت کی بدولت ہے۔ یہ روشن آگ اور یہ مشتعل شعلہ سورج ہی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ سورج آگ کی حیثیت میں خود ہم میں بھی ملا ہوا ہے۔ اسی کی آمد ورفت سے دُنیا کی کل طاقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نشو ونما پاتی ہیں۔ غرض حرارت اور حیات ایک ہی بات ہے ؛

فصل ہشتم

گذشتہ فصل میں آفتاب کی اصلی کیفیت وضرورت بتلا چکے ہیں۔ لہذا ناظرین کو یہ سُنکر کہ کل نجات یافتہ روحوں کا آخری قیام گاہ آفتاب ہے۔ چنداں تعجب نہ ہوگا ؛

لوڈ صاحب کا مقولہ ہے کہ " وہ خوش قسمت مخلوق جو ان کرّوں میں آباد ہے بشبو

روز کی قیود سے آزاد ہے۔ کیونکہ دائمی نور اُن لوگوں کو روشن رکھتا ہے۔ کرۂ آفتاب کے ساکنین مدام سایۂ عاطفت الہٰی میں رہنے والے ہیں ؂

اب اس سوال کا جواب دینا باقی ہے۔ کہ ساکنین کرہ آفتاب کی شکل وصورت کیا ہے؂ مجھکو نہایت افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہنوز علم سائنس نے اسقدر ترقی نہیں کی۔ اور سورج کی حالت کا ہنوز کافی علم نہیں ہوا۔ نجومیوں کی دو متضاد رائیں ہیں۔ اور ہم اسوقت اس رائے کا اختصار کے ساتھ ذکر کرنا مناسب خیال کرتے ہیں ؂

سترھویں صدی کے آغاز میں آفتاب کی نسبت ایک بے قاعدہ خیال پھیلا ہوا تھا۔ معمولی پڑھے لکھے لوگ کہتے تھے۔ کہ یہ آتشی کرہ ہے۔ اس زمانہ میں کوئی ایسا آلہ موجود نہ تھا۔ جس سے سطح خورشید کو ایک نظر دیکھ سکیں ؂

آخر دوربین ایجاد ہوئی۔ اور انہوں نے آسمان کی وسعت کی تحقیقات کی۔ اور بیشمار ستاروں کو گننا شروع کر دیا ؂

دھوئیں سے سیاہ کر کے شیشہ کے ذریعہ سے آفتاب کو دیکھنے کا دستور گلیلیو کے زمانہ میں نہیں تھا۔ پھر بھی اس جوانمرد نے جس طرح بن پڑا۔ شیشے ہی کی مدد سے دیکھکر آفتاب کے داغ معلوم کئے۔ اور ہر روز طلوع و غروب کے وقت دیکھنے سے انجام کار ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ گیا ؂ لوگوں کے دلوں میں ارسطو کی تعلیم جنے کہا تھا۔ کہ آفتاب بالکل بیداغ ہے۔ خوب جمی ہوئی تھی۔ اسلئے انکو اوّل اوّل گلیلیو کی عجیب و غریب تحقیقات سے نہ صرف حیرت بلکہ نفرت ہوئی وہ مذاق اُڑانے لگے۔ کہ یہ داغ آفتاب میں تو نہیں۔ مگر اسمیں شک نہیں۔ کہ گلیلیو کی آنکھ یا اسکے شیشہ میں ضرور ہیں ؂

شکر ہے کہ یہ مذاق اور پھکڑ بازی زیادہ دنوں تک قایم نہ رہ سکی۔ اور انجام کار انہیں گلیلیو کی صادق تحقیقات کو اور آفتابی داغوں کے وجود کو ماننا ہی پڑا ؂

جب خوب تحقیقات کیگئی۔ تو معلوم ہوا کہ آفتاب بھی دوسرے سیاروں کیطرح مدام گردش میں رہتا ہے۔ اور یہ گردش پچیس یوم میں تمام ہوتی ہے۔ اسوجہ سے قرار دیا گیا۔ کہ یوم شمشی یوم ارضی سے پچیس گنے زیادہ بڑے ہیں ؂

اس مقام پر دن کی بابت بھی چند الفاظ بیان کرنے غیر مناسب نہ ہونگے۔ واضح ہو کہ ہم دن اس مدت کو کہتے ہیں۔ جب زمین ایک خاص مقام سے اپنے محور پر گردش شروع کر کے پھر اسی

پہنچ جاتی ہے۔ اور اسمیں دن اور رات دونوں محسوب ہوتے ہیں ؛

لیکن آفتاب میں رات نہیں ہوسکتی۔ اسلئے کہ وہ بذات خاص روشن اور منور کرہ ہے ؛

قبل ازیں ہم بیان کرچکے ہیں۔ کہ آفتاب کے داغوں سے گردش آفتاب کا پتہ لگا ہے۔
اگر ہم اطمینان کے ساتھ بیٹھکر ان داغوں کو دیکھیں۔ تو وہ متحرک معلوم ہونگے۔ اور ایسے دکھائی دینگے۔ کہ گویا وہ کرہ شمسی کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب باآہستگی جارہے ہیں اور اگر ہم چودہ روز تک اسیطرح باطمینان دیکھتے رہیں۔ تو پھر وہ داغ کرہ کے مشرق کیجانب لوٹتے ہوئے دکھائی دینگے۔ اور اتنی دیر میں آفتاب کا پہلا نصف حصہ ہماری نظر کے سامنے روپوش ہوجائیگا۔ اور یہ پورے اٹھائیس روز میں واپس ہونگے۔ لیکن یہ اٹھائیس روز آفتاب کے گردش کا صحیح زمانہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی تو خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ اس گردش خورشیدی کے ساتھ ساتھ اس عرصہ میں گردش ارضی بھی تو جاری رہی ہے۔ کیونکہ زمین بھی تو داغوں کی طرح سورج کے گرد برابر گھومتی رہی ہے۔ اسی گردش کیوجہ سے داغوں کے دیکھنے میں تین روز کا زیادہ وقفہ لگ گیا۔ اگر زمین کو گردش نہ ہوتی۔ تو صرف پچیس ہی روز کے اندر یہ داغ دیکھ لینے ممکن تھے ؛

جسطرح سورج میں دن نہیں ہوتے۔ اسی طرح موسم بھی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اسکا جوہر لطیف ہے جسمیں تبدیلیاں ہوتیں ؛

ساکنین طبقہ آفتاب اپنے چاروں طرف سیاروں کو گردش کرتے ہوئے دیکھتے ہونگے۔ ہماری طرح وہ بھی سیارے اور انکے قمروں کی ہیئت کو دیکھتے رہتے ہونگے۔ اور انکو ان تمام کروں کا صرف نصف حصہ دکھائی دیتا ہوگا۔ جو انکے عظیم الشان کرہ سے روشنی پاتا ہے۔ وہ عطارد اور زہرہ کے بزرگ اور زمین و مریخ کے خورد کروں کو دیکھتے ہونگے۔ مگر مشتری، زحل اور یورنس زیادہ فاصلہ کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہونگے لیکن طبقہ آفتاب کو دمدار ستارے زیادہ عرصہ تک نظر آتے ہونگے۔ اور وہ جسم میں بڑے ہوتے ہونگے۔ اور انکی جانب دوڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہونگے۔ اکثر دمدار ستارے انکو دور جاتے ہوئے اور بعض آفتاب میں گر کر جذب ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہونگے ؛

آفتاب میں دو قسم کے داغ ہیں۔ ایک قسم کا نام امبرا ہے۔ اور دوسری قسم کے پنمبرا کہے جاتے ہیں ؛

پنمبرا کی نسبت امبرا اگرچہ سیاہ ہوتے ہیں۔ تاہم روشنی اور چمک میں وہ چودھویں

کے چاند سے دو ہزار گنے زیادہ ہوتے ہیں ؛

ان داغوں کا عرض و طول بھی کچھ ایسا ویسا نہیں ہے۔ انکا صرف عرض نوّے ہزار میل کا دریافت ہوا ہے۔ انکے مقابلہ میں زمین گویا دسواں حصہ ہے اور وہ بآسانی انمیں سما سکتی ہے ؛

یہ داغ ہمیشہ نہیں رہتے کبھی تو وہ مہینوں اور برسوں دکھائی دیتے ہیں۔ اور کبھی صرف دو چار ہفتوں ہی کے اندر کم و بیش ہو کر بالکل غائب ہو جاتے ہیں ؛

خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ تبدیلی کسی اندرونی حرکت کیوجہ سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ان داغوں میں بسا اوقات کوئی چیز بگولوں کیطرح اِدھر سے اُدھر پھرتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ اور وہ پُرجوش لہروں یا متحرک آگ کیطرح ان داغوں کو اِدھر سے اُدھر لیجاتی ہے۔ سرسری طور پہ آتش فشاں اور افروزاں مادہ کے پُل بھی نظر آتے ہیں۔ جو قریبی داغوں کے درمیان اِدھر سے اُدھر تک معلق ہیں اور ایک منور بند انکو باہم ملاتا ہے۔ اور وہ بند ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے داغ تک پھیلا ہوا ہے۔ بعض اوقات یوں نظر پڑتا ہے۔ کہ بگولے کل عمارات کو زیر و زبر اور مسمار کئے دیتے ہیں ہمیشہ ان میں حیرتناک انقلاب اور عظیم الشان تزلزل کی علامات پائی جاتی ہیں ؛

یہ بگولے اور منور آتشی نشانات ہمارے ہوائی کرہ سے بہت مختلف ہیں۔ وجہ یہ کہ سورج کی ہوا ہزاروں گز بلند ہے۔ اور ہماری ہوا کی نسبت تیرہ لاکھ گنی بڑی سطح کے محیط ہے ؛

یہ جو ہمنے کہا۔ کہ سورج میں بھی ہوا ہے۔ یہ نتیجہ بڑے تجربہ اور غور و خوض سے دیکھنے کے بعد نکالا گیا ہے ؛

ہیئت آفتاب کی بابت ایک قدیم رائے چلی آتی ہے۔ جسکی آجتک کسی مستند ہیئت داں نے تردید نہیں کی۔ اس رائے کو اٹھارھویں صدی میں ہرشل اور ولسن نامی دو مشہور نجومیوں نے قائم کیا تھا۔ اسکے بعد ہمبولٹ اور آرگو نامی نجومیوں نے اسکو اور بھی زیادہ زیر بنا دیا ؛

ہیئت دانوں کی رائے میں آفتاب تاریک اور مشتعل مادہ سے بنا ہوا ہے جسکی وجہ سے یہ ستارہ اسقدر روشن اور منور ہے۔ آرگو اور ہمبولٹ اس منور اور روشن ہوا کا نام فوٹو سفیر قرار دیتے ہیں ؛

اس رائے کے بموجب امبرا اور پنمبرا نامی داغ ایک قسم کے سوراخ ہیں جو آفتاب کی ہوا میں کسی کوہ آتش فشاں کے مادہ کی نکلتی ہوئی گیس یا کسی دوسری نامعلوم وجہ سے بن گئے ہیں۔ جن داغوں کا نام پنمبرا ہے۔ وہ سورج کے نچلے حصہ والی ہوا سے بنے ہیں۔ جو یا تو بذاتہ گرم یا روشن

ہے۔ یا یہ حصہ اوپر کے حصہ یا فوٹوسفیر کے عکس سے کچھ گرم اور منور ہو گیا ہے ؛

اس رائے کو عرصہ تک باور کیا گیا۔ اور سیاہ داغوں کی نسبت رائے قایم کیگئی۔ کہ یہ بھی آتش فشاں پہاڑوں کے ٹکڑوں سے حصوں اور دہانوں کی گیس خارج ہونے سے بن گئے ہیں۔ ان چمکدار داغوں کا نام فیکولی قرار دیا گیا ہے۔ جو سطح آفتاب پر ہر ایک جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ خاص خاص مقامات سے پیدا ہوئے ہیں جنکے باعث سے ہوائے شمسی کے بعض حصص کی ہوا سرد اور کم روشن ہو جاتی ہے ؛

پس اس رائے کی موافقت میں سورج کو بھی دوسرے سیاروں کی مانند ایک تاریک گولہ ہونا چاہیئے۔ جسکے چاروں طرف ایک خاص ہوا کی تہ ہو۔ جو گرمی کو روک سکے۔ اور اس تہ کے باہر فوٹوسفیر ہوا ہو جسمیں گرمی اور روشنی خارج کرنے کی قوت ہو۔ یہ رائے دلسن ہرشل آرگو اور ہمبولڈ کی ہے۔ اسی خیال کے اشخاص کا اعتقاد ہے کہ آفتاب کے اندر ایسے آدمیوں کی بستی ممکن ہے۔ جو انسان سے کسی قدر مختلف ہوں ؛

پس فوٹوسفیر کی گرمی اس سرد ہوا کی درمیانی تہ سے ہو کر اسقدر گذرتی ہوگی۔ جسقدر زندگی قایم رکھنے کے لئے لازمی ہے۔ اور وہ روشنی جو اسطرح چھنکر آتی ہوگی۔ صاف و شفاف ہوتی ہوگی۔ جس سے آنکھوں کو کسی قسم کی چکا چوند یا تلملاہٹ نہ ہوگی ؛

آرگو صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص مجھسے یہ سوال کرے۔ کہ کیا یہ کرہ آفتاب آباد ہے۔ تو اسکا جواب میں یہی دونگا۔ کہ میں اس سے لاعلم محض ہوں۔ مگر ہاں جو کوئی مجھسے یہ سوال کرے۔ کہ کیا آفتاب میں ہمارے جیسی مخلوق کا آباد ہونا ممکن ہے۔ تو اسکے جواب میں میں ضرور ہاں کرونگا

جرمنی کے دو فلاسفروں نے جنکا نام کرشاف اور بنسن ہے۔ آفتاب کی ماہیئت دریافت کرکے ایک نرالی رائے قایم کی ہے۔ انکا بیان ہے کہ آفتاب سرد اور تاریک و سخت نہیں ہے۔ جو فوٹوسفیر یعنی روشن و مشتعل ہوا سے گھرا ہوا ہو۔ بلکہ وہ بہت رقیق اور اپنے ہر ایک حصہ میں جلتا ہوا ہے ؛

اس نئی رائے کے پیش کرنیوالے آفتاب کے داغوں کی نسبت جواب دیتے ہیں۔ کہ کسی نامعلوم باعث سے ممکن ہے۔ کہ ان بخارات میں بھی ویسا ہی انجماد ہو جیسا کہ کرہ ارض کے خارج شدہ رطوبت و بخارات سے بادل بنتے ہیں۔ انہیں بادلوں کی وجہ سے ہماری نظروں سے سورج کے گرد کی روشنی چھپ جاتی ہوگی۔ اور وہی بادل ہمکو داغ کی صورت میں نظر آتے ہونگے ؛

جب یہ بادل بنجاتے ہونگے۔ اور انکی وجہ سے قریب کے بخارات کو بھی سردی پہنچتی ہوگی تو اور بھی زیادہ انجماد ہوتا ہوگا۔ اور اسطرح ایمر اگر کہ ہنیر ابھی بنجاتے ہونگے۔ بس یہ شمسی داغ گویا بادل ہیں۔ جو آفتاب کی ہوا میں معلق دکھائی دیتے ہیں۔ اسی قسم کی رائے گلیلیو صاحب بھی قبل ازیں ظاہر کرچکے ہیں ۔

ان رائیوں کے ساتھ ہم داغوں کی بابت کچھ اور بیان کرنا مناسب خیال کرتے ہیں ۔

ایک جرمن سائنس داں ان داغوں کو ہوائے شمسی کے بادلوں کی بجائے رطوبت آفتابی کا انجماد بتاتا ہے۔ اس بنا پر کہ جب رطوبت پگھلنی شروع ہوتی ہے۔ تو اکثر اسمیں اس قسم کی گانٹھیں سی نمودار ہوا کرتی ہیں۔ جو ٹھوس ہونے کی وجہ سے پگھلتی نہیں ہیں ۔

اب ایم فی صاحب ایک فرانسیسی ہیئت داں کی رائے سنئے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ سورج کو ٹھوس یا رقیق بتانا بالکل غلط ہے۔ وہ صرف ایک گیس ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ وہ بھی ان داغوں کو سوراخ خیال کرتا ہے۔ جو ہوائے آفتاب میں اتفاقیہ انجمادِ بخارات کے باعث پیدا ہوگئے ہیں۔

عام طور پر جرمن فلاسفر کی رائے تسلیم کیجاتی ہے۔ اور سب ہیئت داں اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ کہ آفتاب کے تمام حصص روشن ہیں۔ اور جلتی ہوئی ہوا اس کے گرد ہے ۔

فصل نہم

علم ہیئت و نجوم کی بحث میں سے جو گذشتہ فصلوں میں کی گئی ہے۔ ہم ایم فی وغیرہ سائنٹفک داناؤں کی رائے سے متفق ہیں۔ جو آفتاب کو ایک مشتعل و سوزاں گیس کا انبار بتاتے ہیں۔

مگر اس حالت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سورج فی الواقعہ مجسم گیس سوزاں ہے۔ تو پھر وہ قدسی ارواح جنکا نام ہمنے کسی باب میں فوق الملک رکھا تھا۔ کس مقام پر رہتے ہیں ۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ کہ بشریت سے اٹھکر فوق الملک کے درجہ تک پہنچتے پہنچتے انسان کو ترقی ہوتی ہے۔ ہر قدم پر اسکی قوت مدرکہ بڑھتی جاتی ہے۔ اور جوں جوں ترقی پاتی ہے۔ اسیقدر مادہ میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ حتےٰ کہ وہ سراپا روح ہوکر افضل المخلوقات کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔ کرہ آفتاب میں پہنچنے کے وقت اس میں مادیت بالکل نہیں رہتی۔ پس وہ ایک شعلہ یا سانس یا خیال یا حس کی مانند مادیت سے بالکل مبرا ہوجاتا ہے۔ اسوقت اسکے مقدس جوہر میں کسی قسم کی آمیزش نہیں رہتی۔ اور وہ روح مطلق ہوتی ہے۔ جو جسمانی قیود سے آزاد اور بے پردہ ہے ۔

اسی وجہ سے آفتاب کی وہ منور گیس اسی لطیف جسم کو لے لیتی ہے۔ اور اسکی حرارت وسوزش اسکو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی۔ بلکہ ایسے اجسام کے لئے وہ مناسب سکونت گاہ ہے ؛

اب ہم اس سے بھی اور ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اور دعوے کرتے ہیں۔ کہ آفتاب ان روحانی فوق الملک مخلوق کا نہ صرف مسکن ہی ہے۔ بلکہ انہیں کے مجموعہ کا نام آفتاب ہے ؛

ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ کہ آفتاب ہماری اور کل مخلوقات کی ہستی کا سبب اوّل ہے۔ ہمارے کرّہ میں زندگی اسی کی وجہ سے ہے۔ نیز احساس اور خیال وغیرہ بھی سورج سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو پھر ہم کیوں نہ مان لیں۔ کہ وہ تمام شعاعیں جو آفتاب سے نکل کر کل سیاروں پر پڑتی اور انکو منور کرتی ہیں۔ دراصل انہیں ارواح سے نکلتی ہیں ؛

ہماری یہ رائے تسلیم کرنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ آفتاب اور ہم سیارگان میں کسقدر عمیق تعلق اور کیسا دائمی میل و جول ونقل و حرکت وغیرہ کا ذریعہ ہے ؛

پہلے تو کم از کم بحث ہی کی خاطر یہ تسلیم کیجئے۔ کہ روحوں سے ہی یہ شعاعیں خارج ہوتی ہیں۔ جو زمین اور تمام سیاروں کو منور کرتی ہیں۔ روشنی سے روئیدگی کو جس کے ساتھ قوت حیات بھی ملتی ہے۔ اور کل نباتات اسی حس کو سورج کی عطیہ ثانی یعنی گرمی کی امداد سے حیوانات کو تفویض کرتی ہیں۔ پھر تخم روح جو حیوانات کے سینہ میں رہ کر نشوونما پاتا ہے۔ ایک جانور سے دوسرے جانور میں ہوتا ہوا انسان تک پہنچتا ہے۔ پھر انسان سے وہ فوق البشر بنتا ہے۔ اور اسی طرح یکے بعد دیگرے سلسلہ بسلسلہ اجسام واجرام مادی سے بالکل آزاد ہو کر منزل مقصود یعنی طاقت اور عقل اور خوشی کے مسکن اعلےٰ (آفتاب) میں جا پہنچتا ہے ؛

گویا یہ ایک مسلسل زنجیر ہے۔ جسمیں کل موجودات منسلک ہے۔ اسکی بہت سی منزلیں ہیں۔ جنمیں سے کوئی منزل تو دکھائی دیتی ہے۔ اور کوئی دکھائی نہیں دیتی ؛

اگر کوئی صاحب ہماری رائے سے اختلاف کرینگے۔ تو ہم اُن سے وہ سوال کرینگے۔ جسکا آجتک سائنس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہ یہ کہ آخر اس کتاب میں یہ روشنی اور گرمی کس وجہ سے ہے؟ یہ بات تو نظر اوّل میں ذہن نشین ہو سکتی ہے۔ کہ جب اسقدر کثیر المقدار روشنی اور گرمی آفتاب سے خارج ہوتی ہے۔ تو آخر اسکے مخزن میں از سر نو اور گرمی اور روشنی ڈالنے کی بھی تو ضرورت پڑتی ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ چند روز میں یہ آفتاب [illegible] ہو جاتا ؛

بس یہ صاف ثابت ہے کہ آفتاب بھی کہیں نہ کہیں سے روشنی و گرمی حاصل کرتا ہے۔ مسٹر گلمتین صاحب رقم طراز ہیں۔ کہ پلاٹ صاحب کے تخمینہ کے رو سے اگر آفتاب کو اپنے نقصان کے معاوضہ میں کہیں سے قوت نہ پہنچے۔ تو اسکو فیصدی ایک کے حساب سے سرد ہو جانا چاہیئے۔ اس تخمینہ کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اس کمی کے کسی خارجی اسباب سے پورا نہونے سے دس ہزار سال میں آفتاب کی روشنی و حرارت بالکل غائب ہو جائیگی ؛

اور پروفیسر ٹنڈل صاحب نے جو حال ہی میں تجربہ کیا ہے۔ اسکی بنا پر وہ کہتے ہیں۔ کہ اگر آفتاب کو ہم ایک جلتا ہوا کوئلہ فرض کریں۔ تو پانچہزار سال میں وہ بالکل جلکر راکھ ہو جائیگا مگر سورج کی موجودگی کو کروڑوں برس ہوئے اور اب تک اسکی روشنی اور حرارت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ یہ دعوے ہم اس بناء پر کرتے ہیں۔ کہ زمین کی آب و ہوا جیسا کہ پہلے تھی۔ اب بھی ویسی ہی ہے ؛

زمین کی روئیدگی اور حیوانات کی پیدائیش میں دو تین ہزار سال سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ اس سے پہلے کے تاریخی حالات سے ہمیں آگاہی نہیں ہے ؛

پس جبکہ آفتاب کی حرارت کروڑوں سال سے کم نہیں ہوئی۔ تو وہ کہاں سے آئی اور آجکل کہاں سے آتی رہے ؟ ؛

قبل ازیں خیال تھا کہ چونکہ آفتاب اپنے محور پر گھومتا ہے۔ اسلئے اپنے گرد کے عنصر یعنی ہوائے خالص سے رگڑ تا رگڑ تا ہے۔ اور اسی سے یہ حرارت و روشنی پیدا ہوتی ہے ؛

لیکن اسکے صحیح ماننے میں یہ خیال مانع ہے کہ آفتاب کی مانند دوسرے سیارے بھی تو اپنے محور پر گھومتے رہتے ہیں۔ پھر انکی رگڑ سے بھی گرمی پیدا ہونی چاہیئے۔ بلکہ آفتاب سے بڑھکر گرمی پیدا ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وہ آفتاب سے زیادہ سریع السیر ہیں ؛

علاوہ ازیں اگر آب و ہوا کی بلندی پر غور کیا جائے۔ تو اسقدر کی رگڑ سے اسقدر گرمی کا پیدا ہونا زیادہ سے زیادہ ایک صدی تک ممکن ہے۔ اسلئے مذکورہ بالا رائے کیطرح قابل اعتبار نہیں ٹھہر سکتی ؛

دوسری رائے یہ ہے کہ سطح آفتاب پر شہاب گرتے ہیں جس سے یہ گرمی پیدا ہوتی ہے اس رائے کا مطلب زیادہ وضاحت کیساتھ یہ ہے کہ ان گنت اجرام سورج کے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات اس سے اسقدر نزدیک ہو جاتے ہیں۔ کہ انجام کار اسکی

سطح ہی پر گر پڑتے ہیں۔ اور چونکہ وہ کثیر التعداد ہیں۔ اسلئے ان کے گرنے سے گرمی کا پیدا ہونا ضروری ہے ؛

پروفیسر ٹنڈل صاحب اس معاملہ میں حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں " یہ اندازہ کرنا کہ کشش آفتاب اپنے چوگرد گھومنے والے چھوٹے چھوٹے ستاروں کو کسقدر تیزی دیتی ہوگی۔ چنداں دشوار نہیں ہے۔ جب یہ ستارے دور سے آفتاب کی جانب آتے ہونگے۔ تو انکی تیزی میں بہت اضافہ ہوجاتا ہوگا۔ اور بمشکل اُسکے ارد گرد گھومنے کی قوت رہتی ہوگی۔ یہ رفتار زیادہ سے زیادہ ۳۹۰ میل اور کم سے کم ۲۷۶ میل فی سکنڈ ہوگی۔ ستارہ پہلے تو نہایت تیزی کے ساتھ آفتاب پر گرتا ہوگا۔ اس سے اُسی جسامت کے سخت جلتے ہوئے کوئلہ کے ستارہ سے تو ہزار گنا زیادہ گرمی پیدا ہوجائیگی۔ اور آخرالذکر رفتار سے چار گنا۔ یہاں اِسکی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کہ یہ ستارے مشتعل ہوئے۔ کیونکہ ان کے جلنے سے آفتاب کی حرارت میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ پس انکے متواتر گرتے رہنے سے آفتاب کی زائل شدہ حرارت کی کمی پوری ہوتی رہیگی" ؛

مگر پروفیسر ٹنڈل کی رائے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ستارے اس طرح گرتے رہا کرینگے۔ تو اس سے آفتاب کی جسامت بھی بڑھنی چاہیئے۔ جو کبھی دیکھنے میں نہیں آتی ؛

اس رائے کی تردید میں ایک اور بھی دلیل پیش کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ اس رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سطح آفتاب نہایت سخت ہے۔ درحالیکہ تحقیقات جدید اسکو بخارات یا گیس کا مجموعہ یعنی ایک رقیق کرہ بتلاتی ہے ؛

سنہ ۱۸۴۳ء و سنہ ۱۸۸۲ء میں بہت سے دمدار ستاروں کو سورج کے قریب سے گذرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اسوقت قیاس چاہتا تھا۔ کہ کشش آفتاب کیوجہ سے انکی رفتار میں ہلچل ہونی چاہیئے۔ مگر وہ ستارے سب کے سب نہایت اطمینان و خوشی کے ساتھ آفتاب سے گذرتے ہوئے چلے گئے۔ اور یہ اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ سطح آفتاب سخت نہیں ہے ؛

ایک تیسری رائے بھی ہے۔ جو قیام حرارت آفتاب کیلئے پیش کی جایا کرتی ہے وہ یہ کہ جس مادہ سے آجکل سورج مرکب ہے۔ یہ ہمیشہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اسکے لاتعداد ذرات علیحدہ علیحدہ اور منتشر تھے۔ جو کشش کیوجہ سے رفتہ رفتہ اکٹھے ہوگئے تھے۔ اور اب باقی مادہ کی کشش کیلئے مرکز بن گئے ہیں ؛

اِس رائے سے بعض سائنس دان متفق ہیں۔ مگر ہمکو روزمرہ تجربہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جب

بہت سے ذرّے آپس میں ملکر ٹھوس ہو جاتے ہیں۔ تو ان میں سے بہت سی گرمی خارج ہو جاتی ہے ؛
غرض مذکورہ بالا رائیں ہر چند خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔ مگر ان کا نقص بھی ظاہر ہے
موجودہ سائنس حرارت آفتاب کے نعم البدل ہونے کی نسبت کوئی اطمینان بخش رائے پیش
نہیں کرتا ؛

مگر جس مسئلہ کو سائنس حل کرنے سے ناکامیاب رہا ہے۔ اسکی بابت ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں ؛
ہمارا قیاس کیا بلکہ یقین ہے کہ حرارت آفتاب کی پایداری انہیں ارواح کی وجہ سے
ہے۔ جو مدام آتی رہتی ہیں۔ یہ وسیع طبقات سے آکر آفتاب میں مسکن گزین ہوتی اور پھر وہاں
سے کل مخلوقات عالم کو ایک عام اور کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتہ اور سلسلہ میں باندھ دیتی ہے ؛

وہ آفتاب جس سے علی التواتر گرمی اور روشنی آتی رہتی ہے۔ کہ جو حیات عالم کی
علت اول ہے۔ ہماری رائے میں ارواح کی منزل آخری ہے ؛

چارلس بانٹ صاحب اپنی کتاب میں جو ۱۸۹۰ء میں چھاپی گئی تھی حسب ذیل تحریر
فرماتے ہیں۔ اگر اس مبتدائے فیض نے طبقات زیرین میں اپنی صنعت و قدرت کو ایسی حالت
میں رکھا ہے کہ کل اجسام ایک ہی قاعدہ کی متابعت میں کام کر رہے ہیں۔ تو کیا یہ ناممکن ہے
کہ یہی عجیب و غریب سلسلہ کل سیاروں کی دنیا میں اپنا کام کر رہا ہو۔ اور اس نے موجودات
و مخلوقات کو ایک ہی سلسلہ میں مربوط کر رکھا ہو ؛

اسوقت ہماری نظروں کے سامنے اس عجیب زنجیر کی صرف چند کڑیاں ہیں۔ مگر
کھٹکا ہے کہ شاید ہم ان چند کڑیوں کو بھی بخوبی نہ دیکھ سکتے ہوں۔ کیونکہ ہم بالکل ناکمل طور
سے اس سلسلہ کو دیکھ رہے ہیں۔ اور بہت سے مقامات پر پیچیدگیاں اور رکاوٹیں پاتے ہیں۔
جو دراصل اس سلسلہ میں نہیں۔ بلکہ خود ہمارے ہی علم میں ہیں ؛

یہ کل صداقتیں باہم منسلک ہیں۔ اور گو دور نظر آتی ہیں۔ مگر فی الواقع بہت ہی نزدیک ہیں ؛
انسانی عقل سیاروں کی دُنیا سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ وہ خدا کے رہنے کی جگہ تک
پہنچ گئی ہے۔ انسان اس نور مجسم کے بلند تخت کا بھی تصور کرتا ہے جسکی زیر سایہ یہ تمام کرے
گھوم رہے ہیں۔ اور اسی کی متابعت میں سب کام کرتے ہیں ؛

اُس خلاق عالم کے گھر میں بہت جگہ ہے۔ مگر وہ جگہ باہر یا دہلیز میں نہیں ہے۔ بلکہ
وہ مخلوق کے پاک معابدوں میں ہے۔ جو اسکے دائمی مسکن ہیں۔ ہم اسکی دوراندیشی کی تاریخ

اسکے سلطنت کے راز اور اسکے قانون قدرت سے اِسی مقدس مکان میں جاکر آگاہ ہوسکتے ہیں ؛

اِس دُنیا میں ہمکو بہت سی باتیں معلوم نہیں ہیں ۔ فلسفہ اِن کے حل کرنے سے سرِ عجز جھکا چکا ہے ۔ سائنس نے انکار کر دیا ہے ۔ مگر مذہب جسطرح ہوسکتا ہے ۔ حل کرتا ہے ؛

بہت سی باتیں آج ہمکو معلوم نہیں ہیں ۔ مگر جوں جوں ہم کتاب قدرت کا مطالعہ کرتے جائینگے ۔ ہم پر سرّ درون کھلتے جائینگے ؛

کبھی ہماری خاص تاریخ بھی ہوگی جبمیں ہمکو ان کل مصیبتوں ۔ امتحانوں اور تکلیفوں کا پتہ لگ جائیگا ۔ جو ہم پر پڑ چکی یا پڑتی رہتی ہیں ۔ اور اسوقت ہم اطمینان کے ساتھ کہینگے ۔ کہ خدا نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا ہے ۔ درحقیقت وہی مناسب تھا ؛

یہ دُنیا وہ ہے جہاں ہم صرف نتیجہ ہی دیکھ سکتے ہیں ۔ سبب تو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے ۔ مگر اُس دُنیا میں اسباب بھی دکھائی دینگے ۔

ذات وحدہٗ لاشریک کے سوائے صداقت اور اصلیت ملنی محال ہے کیونکہ وہی ہستی مطلق ہے ۔ جو اس دُنیا میں ہے ۔ باقی سب اسی کی وجہ سے ہے ۔ ہستی صرف ایک ہے ۔ اور وہ اسی کی ہے ۔ اور اسکی ہستی کی وجہ سے یہ کائینات ہے ؛

اب اس سے پہلے کہ ہم اس باب کو ختم کریں ۔ اتنا اور بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کئی قدیم قوموں کی عبادت کے طریقے بھی اس دنیا میں سورج کی کارروائی کے نتیجہ پر تھے ؛

ایشیا بالخصوص فارس میں ہمیشہ آتش پرستی ہوتی رہی ہے ۔ فارس ہی کے ساحل سے پہلے پہلے ایرانی یورپ میں آکر آباد ہوئے ۔ ایشیا کا طریق آتش پرستی سب سے قدیم ہے ؛

چنانچہ مسٹر بر نوف صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "اُس زمانہ کے آدمیوں (ایرانیوں) نے دیکھ لیا تھا ۔ کہ سطح ارض پر ذی روح موجودات کی حرکت کا اصلی باعث آگ ہے جو برق وباد و رعد کی شکل میں جلتی ہے ۔ مگر رعد بجلی میں چھپی ہوئی آتش ہے ۔ جو اسی کے ساتھ ہَوا میں بلند ہوتی ہے ۔ گرمی ہی کی وجہ سے ہَوا بھی چلتی ہے ۔ کیونکہ وہی اسکو لطیف و رقیق کرنے کا باعث ہے ۔ اگر گرمی کم ہوتی ہے ۔ تو ہَوا بھی غلیظ اور بھاری ہو جاتی ہے ۔ نباتات اپنے میں حرارت آفتاب سے اکتساب کرتے ہیں ۔ آفتاب انکو حرارت پہنچا کر اُگاتا ہے ۔ ہَوا میں شعاع خورشید (دھوپ) سے گرمی پیدا ہوتی ہے ۔ پانی بھی شعاعوں کی بدولت ہی رقیق ہے ۔ بادل میں بجلی کوندتی ہے ۔ ابر سے بارش ہوتی ہے ۔ پانی سے دریا بنتے ہیں ۔ دریا کا پانی سمندر میں جاتا ہے ۔

غرضیکہ یہ تمام و کمال حرکت جس سے کائنات میں زندگی بکھری ہوئی ہے۔ آگ ہی کی بدولت ہے۔ اور وہ آگ آفتاب سے آتی ہے۔ جو گویا علتِ اول اور مبدا فیض ہے ؂

انکے نزدیک خیالِ حیات بھی آتش سے علیحدہ نہ تھا۔ زمانہ قدیم کے انسانوں نے دیکھ لیا تھا کہ نباتات میں حرارت جمع ہوتی ہے۔ ویدوں میں تذکرہ ہے کہ جب وہ بیدی پر آگ جلاتے تھے۔ تو خیال کرتے تھے۔ کہ وہ آگ کو باہر نکلنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ اور جب انہوں نے حیوانات کی جانب خیال کیا۔ تو حرارت وحیات کا اور بھی عمیق تعلق پایا۔ کیونکہ زندگی کے قیام کی وجہ یہی گرمی ہے بغیر حرارت کے دنیا کا کوئی ذی روح زندہ رہ ہی نہیں سکتا؛

تین طرح پر دنیا میں گرمی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک تو آفتاب کے ذریعہ سے دوسرے جلنے والی اشیاء کے ذریعہ سے تیسرے تنفس کے ذریعہ سے۔ جیسے ہوا اپنی حرکت سے بدلتی رہتی ہے؂

پرستش آفتاب کا طریقہ اب تک افریقہ کے وحشیوں میں جاری ہے ؂

امریکہ کے قدیم باشندے بھی آفتاب پرست ہی تھے۔ جو انکی تاریخوں سے بخوبی ثابت ہوتا ہے ؂

کیا آغاز عالم کی اس آفتاب پرستی کو قدرت کی باطنی ہدایت اور ندائے غیب کا نتیجہ نہ کہنا چاہیئے ؂

فصل دہم

ارواح کی کیفیت لکھنے کے بعد اب ہم اُن تعلقات کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہم میں اور ہوائے خالص کے باشندوں (فوق البشر) میں باہمہ دوری قایم ہیں ؂

فوق البشر کے اوصاف کو ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ اس مقام پر یہ دکھانا مقصود ہے۔ کہ وہ روحانی مخلوق اگر چاہے تو اس دنیا کے ساکنین سے رشتۂ اتحاد قایم کر سکتی ہے ؂

گو ان سوالات سے کہ یہ رشتۂ اتحاد کیونکر قایم ہو سکتا ہے؟ اور کہ وہ کونسی تاربرقی ہے۔ جسکا استعمال اس مطلب کیلئے فوق البشر کرتے ہیں۔ ہم ناواقف وبیخبر ہیں۔ اور ہم انکا کچھ تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ تاہم اس میں شک نہیں۔ کہ بوجوہات ذیل فوق البشر اور بشر میں سلسلہ اتحاد ضرور قایم ہے ؂

مدت دراز سے ہم ان تعلقات کی بابت دوسرے لوگوں کے مشاہدات سنتے چلے آتے ہیں۔ بیشک یہ ایک طرح کی اخلاقی صداقت ہے۔ اور یہ نہیں ہو سکتا کہ سب جھوٹ بولیں

اور دھوکہ دیں۔ بات یہ ہے کہ جن لوگوں کا ان واقعات سے تعلق ہے۔ وہ عموماً ادنےٰ تعلیمیافتہ
اور ادنےٰ طبقہ کے ہیں۔ جو اپنے مطلب کو مناسب طور سے ادا اور ظاہر نہیں کر سکتے ؛

ارواح اور بھوت وغیرہ کی بابت بہت سے تعلیمیافتہ لوگ بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔
۱۸۵۰ء سے ایک جدید قاعدہ مسمریزم کا ایجاد ہوا ہے۔ جسکے ذریعہ سے لوگ ہر ایک روح
کو میز پر بیٹھکر بلانے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ انکا اعتقاد ہے کہ اس طریقہ سے وہ مردوں کی روحیں
خواہ وہ انکے عزیزوں کی ہوں یا غیروں کی اپنے معمول کے ذریعہ سے بلا سکتے ہیں۔ اور وہ
شخص یعنی معمول غفلت کی حالت میں اس روح کی طرف سے ہر ایک سوال کا جواب دیتا
ہے۔ اور اسوقت جو کچھ اسکے دماغ میں آتا ہے۔ اسکو وہ مردوں کے پیغام کی صورت میں ظاہر کرتا ہے

گو ہم اس ذریعہ استفسار کو بھوتوں کے ماننے کی طرح فضول اور بیہودہ سمجھتے ہیں۔ مگر
ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھتے ہیں۔ کہ روحوں سے گفتگو کرنے کا دنیا میں کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور موجود ہے
اور وہ ذریعہ کیا ہے ؟ ۔ وہ خواب ہے ؛

ہمارا دعوےٰ ہے کہ عام خواب میں انسانوں کو اس قسم کی بہت باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جو
براہ راست روحوں سے آتی ہیں ؛

تا حال کسی شخص نے کافی طور سے خواب کے مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ یہ ایک ایسی حالت ہے۔
جبمیں جسم پر موت کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن اس عارضی موت کے باوجود بھی
روح میں قوت احساس باقی رہتی ہے۔ اور یہ قوت بسا اوقات خواب کے منظر میں بڑے
زور سے ظاہر ہوتی ہے ؛

اب یہ جاننا چاہیئے کہ فوق البشر میں مادی حصہ کی نسبت روحانی حصہ زیادہ ہے اور
اسمیں عقل بکثرت ہے۔ ایسا ہی انسان میں بھی عالم خواب میں روحانی عقل زیادہ ہو جاتی ہے۔
اور اسوقت اسکو فوق البشر سے مشابہت تامہ ہوتی ہے۔ پس یہ سمجھنا آسان ہے کہ اس
وقت ان دونوں میں ایک دوسرے کی جانب خوب کشش ہوتی ہے۔ ایک نہایت سچی انگریزی
ضرب المثل ہے کہ "رات صحیح مشورہ کا وقت ہے"۔ اس لئے یہ کہنا کیا کچھ غیر مناسب ہوگا کہ
شب کے وقت وہ ارواح جنکو اس عالم میں ہم بہت عزیز تھے۔ ہمکو اکثر فائدہ پہنچاتی اور صحیح
مشورہ دیتی ہیں۔ ایسا تو اکثر ہوا ہے۔ کہ عالم پریشانی میں ہمکو نیند آگئی ہے۔ اور پھر خواب میں
ہمنے ادائے کار کی بنظیر صحیح ترکیب معلوم کی ہے۔ جس سے ہم صبح کو خوش وخورم اپنے بستروں

سے اُٹھتے ہیں بھی اس مسئلہ کی تشریح ہے۔ جسے ہم نے سطور بالا میں حوالۂ قلم کیا ہے ؛

زمانہ قدیم میں لوگ خواب کی باتوں پر بہت یقین کرتے تھے۔ بلکہ انہیں ہدایات الٰہی اور احکام خداوندی سمجھتے تھے۔ بڑٹولن صاحب کا مقولہ ہے کہ "بہت سے وہ عزیز جو ہمیں ملنے والے ہیں۔ عالم خواب میں ہم پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ بارہا خواب ہی میں ادویات کا طریق استعمال معلوم ہوا ہے۔ چوری کے خطرات کا پتہ لگا اور مدفونہ خزانہ کا علم ہو گیا"

مذہب عیسوی کے پیرؤں کو بھی خواب پر اعتقاد ہے ؛

اس سے ہمارا یہ مقصد نہیں۔ کہ صرف عالم خواب ہی میں انسان اور فوق البشر میں سلسلہ تعلقات قائم ہو سکتا ہے۔ بلکہ ہمارا دعوٰے ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جن پر عالم بیداری میں بھی اس قسم کے معاملات گذرے ہیں ؛

مگر اس قسم کے اثرات سے متاثر ہونے کی ہر شخص میں قابلیت نہیں ہوتی فوق البشر اپنے آپ کو انہیں لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے انکو ہوتی ہے۔ اور جنہیں وہ مصائب و خطرات سے بچانا چاہتے ہیں۔ اکثر والدین عالم بالا سے اپنی اولاد کے پاس آتے ہیں جیسے موت کے زبردست ہاتھ نے انہیں جدا کر دیا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ جو پیاری ماں کی گود سے عین پیار کے وقت چھن گیا تھا۔ اسے تسلّی دینے آتا ہے۔ دوست پیارے دوست سے مرنے کے بعد بھی سلسلہ اتحاد قائم رکھتا ہے۔ صرف ظاہر میں لوگوں کی نگاہ سے حجاب ہوتا ہے۔ اور موت پر فتح حاصل ہوتی ہے ؛

ایسے روابط و ضوابط کے لئے انسان کا دل پاک ہونا ضروری ہے۔ اور نیز یہ کہ مرحوم کی محبت و عظمت اسکے دل میں جانشین ہو ؛

جن والدین کو محبت تو کجا اپنا بچہ یاد بھی نہیں ہے۔ وہ ہرگز مندرجہ بالا ربط و ضبط سے شیریں کلام نہیں ہو سکتے جس دوست نے اپنے دوست کا نقشہ تک دل سے بھلا دیا ہے۔ بھلا پھر وہ کس طرح اس سے ملاقات کی خواہش رکھ سکتا۔ اور خوشی حاصل کر سکتا ہے ؛

نیز وہ لوگ جو شہوت پرست بداخلاق۔ اور سفلی جذبات کے غلام ہیں خواہ اپنے دل میں عزیز دوں کی کتنی ہی محبت رکھیں۔ ان سے ملاقات نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ارواح ایسے نجس لوگوں کے پاس آنا پسند نہیں کر سکتیں۔ ہاں پاک طینت اشخاص سلسلہ اتحاد قائم رکھ سکتے ہیں ؛

ہمارے دلوں میں ایک خاص اخلاقی قوت ہے جسے آجتک کسی فلاسفر نے بیان کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اسکا نام کانشنس یعنی ضمیر ہے۔ وہ گویا ایک قسم کی آگ ہے۔ جو ہر وقت ہمارے دلوں میں مشتعل رہتی ہے۔ جو نہ تو کسی کے پھیلنے سے بجھ سکتی ہے۔ اور نہ کسی کے خاک ڈالنے سے مدھم ہو سکتی ہے۔ ہر موقع پر ہمارا کانشنس ہی ہمکو سچی ہدایت کرتا ہے۔ کانشنس بتلاتا ہے۔ ہر مقام پر وہ بدی کو نیکی اور بے ایمانی کو ایمانداری سے تمیز کرانے کی تحریک کرتا ہے۔ بس اس کانشنس کی نسبت ہمارا خیال ہے کہ وہ ایک اثر ہے۔ جو مرحوم عزیزوں کی جانب سے ہمارے دلوں میں پڑتا رہتا ہے۔ یہ کانشنس ایک خیر اندیش دوست اور کبھی خواہ رشتہ دار ہے۔ جو ہمکو نیک و بد معاملات میں دخل دیتا ہے۔ تاکہ ہم اپنے کاروبار میں اس سے اعانت حاصل کریں۔

جو لوگ بزدل۔ کمینہ۔ بداخلاق اور جھوٹے ہیں۔ ان کی بابت ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ کانشنس سے بالکل مبرا ہیں۔ انہیں یہ اخلاقی قوت ممیزہ ملی ہی نہیں۔ اسلئے وہ بدی اور نیکی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تو کسی کو پیار کیا نہیں۔ پھر انکی ناپاک روح اس قابل کیسے ہو؟ کہ پیار کرنے والی ارواح ان سے تعلقات قایم کریں؛

اس موقعہ پر ہم ناظرین سے سوال کرتے ہیں۔ کہ آیا انکے دلوں کو بھی کبھی انکی پیاری ارواح نے متاثر کیا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ بہت سے اصحاب کو ایسا موقعہ پیش آیا ہوگا؛

دوسری دُنیا سے پیغام

مس سٹیڈ جو مشہور عالم اخبار نویس مسٹر سٹیڈ سورگباشی کی صاحبزادی ہیں۔ آجکل امریکہ میں ہیں۔ آپ نے ایک اخبار کے قایم مقام سے بیان کیا۔ کہ میرے پاس میرے باپ کی طرف سے روح کے ذریعہ سے پیغام آتے ہیں۔ میرے باپ نے دوسری دُنیا میں جانے سے پیشتر جو نظر نہیں آتی ہے۔ مجھے روحانی طور پر نامہ و پیام کیا ہے۔ یہ اس ہولناک رات کا ذکر ہے جبکہ جہاز ٹیٹانک ڈوبا تھا۔ جونہی کہ وہ اپنی کوٹھڑی میں آرام کرنے جا رہا تھا۔ اسے کسی چیز نے چوٹ لگائی۔ وہ ایک نہایت ہولناک چوٹ تھی جس سے وہ بیہوش ہو گئے۔ اور اس دُنیا میں پھر کبھی ہوش میں نہ آنے پائے۔ بلکہ روحوں کی دُنیا میں داخل ہو گئے۔ میرے باپ نے اس حادثہ کے درد انگیز اور ہولناک نظارے ہم سے بیان کئے۔ اور جہاز کے مسافروں پر جو خوف و دہشت سوار تھی۔ انکے ساتھ ہمدردی کا اظہار کی۔ کہ دیکھا کہ تھوڑی دیر میں وقت آ گیا؛

کچھ عرصہ سے میرے باپ کے ساتھ میری جو بات چیت ہو رہی ہے۔ اسکا ذکر کرنے
میں [illegible] نہیں آتا۔ جیسا کہ اس پر وچار کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری دنیا میں
[illegible] کے بعد ہی میرے باپ نے مجھے ہدایت کی کہ میں امریکہ جاؤں۔ جسے علم ہے کہ
[illegible] میں موجود ہوں۔ میرے پاس میرے باپ کے پیغامات عموماً وہ کسی ایسی
[illegible] سے آتے ہیں۔ جو ٹیلی پیتھی کے مشابہ ہوتی ہے۔ یعنی اس پیغام کی مانند جو دلوں
[illegible] میں پیدا ہوتا ہے ۔

[illegible] آرام سے بیٹھی ہوتی ہوں۔ یا مجھ پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے جیسی
[illegible] روحانی تصور کے وقت ہونی چاہئے۔ ایسے وقت میں مجھے اپنے باپ کی آواز آتی
[illegible] دیتی ہے۔ اسی وقت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرا باپ جسمانی حالت میں مجھ سے باتیں
[illegible] اس وقت چونکہ زندگی کی مادی صفت کا مجھ پر غلبہ ہوتا ہے۔ اسلئے مجھے یہ حیرت ہوتی
[illegible] خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے کوئی خبر خواب کی حالت میں موصول نہیں ہوتی
[illegible] اسکے حاصل کرنے کیلئے مجھے کوئی اور ذریعہ استعمال کرنا پڑا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے
[illegible] میرے باپ کے پیغامات ایک خود بخود [illegible] ہیں آنیوالی تحریر کے ذریعہ سے آتے ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ دو ایسے انسانوں کے درمیان اکثر اوقات ٹیلی پیتھی موجود ہوتی ہے۔ جو ایک
[illegible] حلقہ میں روحانی یگانگت رکھتے ہوں۔ مثلاً والدہ اور بچہ یا عاشق و معشوق۔ میں نے
اس موقع پر لفظ برقی استعمال کیا ہے۔ کیونکہ میرے باپ کے پاس سے آنیوالا پیغام مجھے ایک
[illegible] کی لہر معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ لہر آواز کی لہر سے بھی زیادہ ہلکی ہوتی ہے۔ وہ ان لہروں کی
مانند نہیں ہوتی جن کے ذریعہ سے ہم روشنی کو دیکھتے ہیں ۔

[illegible] اب یہ تسلیم کرتے گئے ہیں۔ کہ ہر شخص کے اندر یا تو شیت بجلی ہوتی
[illegible] ہے۔ اسلئے اسکی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ کہ برقی کشش یا پیغام کیوں نہیں ہو سکتے ۔

دیگر

آجکل امریکہ میں ایک لیڈی نے ان چٹھیوں کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ جو ایک [illegible]
[illegible] نے ملک عدم سے اس کے پاس بھیجی ہیں۔ یہ شخص جس نے کہ چٹھیاں بھیجی ہیں۔
ایک بڑا مشہور قانون دان تھا۔ اور بعد میں جج ہو گیا تھا۔ اس کا نام سٹڈ یو ڈیج تھا۔ یہ
شخص [illegible] سپرچولسٹ بھی نہ تھا۔ جو روحوں کو بلاتے اور ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ نہ کوئی

ضعیف الاعتقاد شخص تھا۔ یہ چٹھیاں اُسنے ایک لیڈی سے لکھوائی ہیں۔ جس کا نام السا بارکر تھا؛

اس کتاب کی مصنّف اگر کوئی معمولی عورت ہوتی۔ تو خیال ہوسکتا تھا۔ کہ کسی نے دنیا کو دھوکا دینا چاہا ہے۔ لیکن لیڈی السا بارکر نیویارک کے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں نہایت ممتاز یا شخصیت ہے۔ یہ کئی ایک ناولوں کی مصنّفہ ہے۔ اگر وہ کسی عدالت میں بطور گواہ پیش ہو تو جج اُسکی شہادت کو درست تسلیم کریگا؛

پہلی چٹھی کا مضمون

"میں یہاں ہوں۔ غلطی نہ کرو۔" وغیرہ وغیرہ۔ یہ الفاظ السا بارکر کے ہاتھ نے بڑے بڑے موٹے موٹے لکھے جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی بیرونی طاقت اس سے لکھوا رہی ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ لکھنے کے بعد اسکے دائیں ہاتھ میں درد پیدا ہوگیا تھا۔ مسٹر السا بارکر کو معلوم ہی نہ تھا۔ کہ مسٹر ہیچ فوت ہوگیا ہے۔ جب وہ نیویارک سے آئی تھی۔ تو اُسوقت وہ زندہ تھا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جس روز یہ اُس سے لکھوایا گیا تھا مسٹر ہیچ کی وفات کو ایک ہفتہ گذرا تھا؛

ملکِ عدم کی روشنی

جج ہیچ کی عمر ۷۰ سال کی تھی جبکہ اُسنے قضا کی۔ وہ بڑا ہی نامور وکیل اور فلسفی تھا۔ اور بہت سی کتابوں کا مصنّف۔ سوسائیٹی میں اُسکی نیک چلنی۔ بلند خیالی اور علم و فضل کی وجہ سے بڑی عزت تھی۔ پہلی چٹھی میں اُس نے لکھا کہ ملکِ عدم میں اندھیرا نہیں ہے۔ یہاں کی روشنی عجیب قسم کی ہے۔ جو کرہ ارض پر آفتاب کی روشنی سے بدرجہا بہتر ہے البتہ تمہاری دُنیا میں اندھیرا ہے۔ اوّل اوّل پیرس میں مجھے راستہ ہی مشکل سے نظر آیا۔ اور تمہاری صورت بھی میں مشکل سے پہچان سکا؛

موت سے اس دُنیا میں بھی چھٹکارا نہیں ہے جسطرح ارضی دُنیا میں موت کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح روحانی دُنیا میں موت کا چرچا رہتا ہے۔ تمہاری دُنیا سے جب کوئی روح جسم کو چھوڑتی ہے۔ تو تمہارے ہاں موت واقع ہوتی ہے۔ لیکن جب کوئی روح روحانی دُنیا سے اپنا تعلق چھوڑ دیتی ہے۔ تو تمہارے ہاں ایک بچہ جنم لیتا ہے۔ میخواروں کا جسطرح ارضی دُنیا میں بُرا حال ہوتا ہے۔ اسی طرح اُن کا روحانی دُنیا میں حال ہوتا ہے میخواروں کیلئے

ہولناک خبر یہ ہے کہ جو روحیں شراب کی ہوس میں دُنیا کو چھوڑ دیتی ہیں۔ وہ اُن کے جسم سے جنہوں نے شراب پی ہو۔ الکحل چوس کر اپنا شوق پورا کرتی ہیں۔ روحانی دنیا میں ہماری خطرناک حالت نہیں ہے۔ بالکل ایسی بات ہے کہ ایک مُلک سے جب کوئی اجنبی ہماری روحانی دُنیا میں آتا ہے۔ تو اُسے سب آدمی اجنبی نظر آتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر ایک سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے باہم یہ سوالات ہوتے رہتے ہیں۔ کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو وغیرہ۔ روحانی دنیا میں ایک بات عجیب ہے۔ یہاں روحانی مادہ کثرت سے ہے اور اس پر ایسی آسانی سے کام کیا جاتا ہے۔ کہ خیال کرتے ہی ہر ایک چیز بنجاتی ہے۔ اور کوئی شخص کسی ضرورت کی چیز کو خیال کرتے ہی حاصل کر لیتا ہے۔ ہماری دُنیا کی طرح یہاں ایسا نہیں ہے کہ لوگ وہی اشیاء حاصل کر سکتے ہیں۔ جنکی انکو ضرورت ہے۔ یہاں تو خواہش کرنے کی دیر ہے جو کچھ چاہیں مل سکتا ہے۔

روحانی دُنیا میں مذہبی مباحثے اور جھگڑے ختم نہیں ہو جاتے۔ مرنے کے بعد بھی پرانی عقائید اور تعصبات قائم رہتے ہیں۔ بلکہ بڑھ جاتے ہیں۔ روحانی دُنیا میں نہ کارخانے ہیں نہ مشینیں۔ نیز وہاں جائیداد کی ملکیت کا سوال ہی نہیں رہتا۔ لیکن باقی سب باتوں میں اس دنیا کی سی کیفیت ہے۔ نیک۔ بد۔ دانا اور بیوقوف مرنے سے بدل نہیں جاتے۔ وہاں زیرک اور چالاک آدمی بھی ہیں۔ احمق اور سست بھی۔ وہاں انجمنیں اور سوسائٹیاں بھی ہیں۔ جو نئے آنیوالوں کی مدد کرتی ہیں۔ دوسری دُنیا میں کرنی کا پھل ضرور ملتا ہے۔ بعض روحیں اپنے عقیدہ کے موافق اپنے تئیں ... ہوئے نرک میں رہتی ہیں۔ جہاں سخت قسم کی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ اسیطرح سورگ لوک میں وہ خوشیاں ہیں جنکی نظیر اس دنیا میں نہیں ہے۔

اب سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ یہ کس طرح مان لیا جائے۔ کہ یہ چٹھیاں مسٹر ڈیو ویچ کی ہیں۔ اس سوال کا جواب ہم اپنے الفاظ میں دینا مناسب خیال نہیں کرتے۔ ہم اس کے متعلق مسٹر ڈیو ویچ کے لڑکے برٹرس ہیچ مشہور انجینئر کی رائے دیئے دیتے ہیں۔ اس سے بڑھکر اور کیا تصدیق ہو سکتی ہے۔ کہ یہ چٹھیاں درحقیقت مسٹر ہیچ کی ہیں۔ مسٹر برٹرس ہیچ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ درحقیقت یہ تحریر میرے والد مرحوم کی ہے۔

فرانسیسی کسان تو مُردوں کیساتھ ربط و ضبط رکھنے کا ایک عام اعتقاد رکھتے ہیں شہر والے اپنے عزیز کی موت کی نسبت بہت کچھ غمگین خیالات رکھتے ہیں۔ مگر گاؤں والوں

میں یہ بات نہیں ہے۔ انکا خیال ہے کہ موت بات ہی کیا ہے۔ مرحوم کا رشتہ الفت تو کبھی قطع ہوگا ہی نہیں۔ جن جن سے وہ اپنی زندگی میں محبت رکھتا ہے۔ انکو موت کے بعد بھی یاد رکھیگا۔ اہل مغرب کی طرح اہل مشرق موت سے چنداں خوف نہیں کھاتے؛

باب ماسبق کے اختتام پر ہمنے چارلس بانٹ صاحب کے خیالات کا اقتباس درج کیا تھا۔ اور اس باب کو ہم ڈوپال ڈی میرس کے خلاصہ خیالات کے اندراج کیساتھ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔ "ہم ان موجودات کے علم سے محض بے بہرہ ہیں۔ ہم ایسی باکمال ارواح سے جو ہم سے بہرحال افضل ہیں کس لئے لاعلم ہیں؟۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس وہ حواس اور ذرائعہ نہیں ہیں۔ جنکی وساطت سے ہم اس اعلےٰ مخلوق کے ساتھ ربط وضبط پیدا کرسکیں۔ انسان اگر کسی حیوان کو فایدہ پہنچاتا ہے۔ تو وہ اِس فائیدہ رسانی میں صرف اپنا اطمینان اور خوشی دیکھتا ہے۔ اسکے سوائے وہ کچھ نہیں چاہتا۔ پس جیساکہ ہم اپنے چھوٹے بھائیوں یعنے ادنےٰ درجہ کے جانوروں کو جنکے حواس ہماری نسبت بہت محدود اور عقل بہت کم ہے۔ فائیدہ پہنچاتے ہیں۔ اِسی طرح وہ اعلےٰ روحانی مخلوق جنکا نام ہماری زبان میں فرشتہ ہے۔ اور جو عقل و ادراک میں ہمسے کہیں بڑھ چڑھکر ہیں۔ ہمکو فیض پہنچاتے اور ہمارے ساتھ فیاضی سے سلوک کرتے ہیں"؛

ہمکو انکا وجود بخوبی ثابت ہوگیا ہے۔ لہٰذا انکے جسم پر کہ آیا وہ مادہ سے بنا ہے یا روح سے بحث کرنا فضول ہے۔ صرف یہی مان لینا کہ وہ ہم سے زیادہ عقیل و ذکی طبیعت کے ہیں۔ کافی ہے؛

فوق البشر کی بابت مزید علم حاصل کرنے کیلئے ہمیں سمجھدار حیوانات پر غور کرنا چاہئیے جس طرح حیوانات سے ہم فائق ہیں۔ اسی طرح ہم سے وہ فائق اور افضل ہیں۔ انکی ہستی ہمسے اس درجہ قابل ترجیح ہے۔ کہ ہم اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ فوق البشر میں ہماری طرح نقائیص نہیں ہیں۔ ہم انہیں چال اور دم کسی طرح نہیں دے سکتے۔ ریاکاری کرکے انکے روبرو اپنے اعمال چھپانا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ کیونکہ ان کی نظر ہمارے پوشیدہ سے پوشیدہ کاموں پر پڑتی ہے۔ وہ ہماری ہرایک بات سنتے ہیں حتےٰ کہ ہمارے دل کے پردوں کے اندر گھس کر ہمارے باطنی سے باطنی خیالات تک جان سکتے ہیں۔ نہ معلوم کتنے طریقوں سے وہ ہمارے دلی رازوں سے مطلع ہوسکتے ہیں؛

اگر انکی دوستی انکی ملاقات اور انکے اعتبار سے ہمیں فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔ اگر محبت۔ خوشی اور نیکی کا سلسلہ ہمارے اور انکے درمیان قائم ہو سکے۔ تو ہم اس مقدس سلسلہ اتحاد کی خاطر کیا کچھ صرف کرنا پسند نہیں کر سکتے؟ انہیں نہ تلون ہوتا ہے۔ اور نہ یہ کبھی کسی کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ کبھی ہمسے جدا نہیں ہوتے۔ ہماری تنہائی کے موقعہ پر یہ ہمکو فوراً ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ خواہ ہم سفر میں ہوں یا وطن میں۔ جلاوطنی کی حالت ہو یا ہم محبوس بلا ہوں۔ یہ روحانی رفیق ہر مقام پر ہمارے ساتھ رہتے ہیں ؛

نہ ہمارے سوالات کا ہر وقت جواب دے سکتے ہیں۔ غرضیکہ وہ غائبانہ محبت خاص ہماری ہر قسم کی خدمات بجالاتے ہیں۔ ہم خیالی شخصیت کا تصور کر کے اپنے دل میں نیک اوصاف بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ ہماری معاون نیک روح جو نیک کاموں کی جانب بالطبع مائل ہوتی۔ اور بدیوں سے متنفر رہتی ہے۔ ہمیں تقدس میں درگاہ الٰہی تک پہنچا دیتی ہے۔ اس مقام پر سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم مُردہ روحوں سے کس طرح گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہم اس جگہ اس سوال کا جواب اپنی طرف سے کچھ نہیں دینا چاہتے ؛

فصل یازدہم

گو بلحاظ شمار و اعداد وغیرہ حیوانات کی ہستی دُنیا میں بہت کچھ قابل غور ہے مگر ہمنے تاہنوز ان کا بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اب ہمارا ارادہ ہے کہ ہم انکی حیثیت کی تشریح کرنے کی کوشش کریں ؛

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا حیوانات ذی روح ہیں؟ اسکا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہاں ہم انکو ذی روح مانتے ہیں۔ مگر انکی روح میں ہماری سی تیزی اور تفہیم نہیں ہے۔ گھڑیال کی روح میں ایک اور قسم کی کیفیت ہے۔ کتے اور عقاب وغیرہ کی روح کی اور حالت ہے۔ حیوانات خورد۔ زوفائیٹ اور مونگا میں روح صرف تخم کی حیثیت میں رہتی ہے یہی روح پرورش پا کر حیوانات میں درجہ بدرجہ ترقی پاتی اور مکمل ہوتی جاتی ہے۔ سپنج اور مونگا۔ زوفائیٹ حیواناتی دنباتاتی ہیں۔ ان میں حیواناتی خاصیت ہے تو ضرور۔ مگر بالکل غیر محسوس تاریکی کی حالت میں نباتات کیطرح یہ بےحس وحرکت کھڑے رہتے ہیں۔ اور حیوانات کی سی آزادانہ حرکت انمیں نام کو نہیں پائی جاتی۔ مگر انکا طریق حصول غذا بالکل حیوانات کا سا ہے۔ اور ما سیوصبہ

سے سائنس داں انہیں حیوانات میں شمار کرتے ہیں۔ خیال کیا گیا ہے۔ کہ ان میں مکمل روح نہیں ہے صرف روح کا بیج ہے۔ جو گویا روح کی ابتدا سمجھنی چاہیئے۔ مونگا میں حرکت کا اظہار بہ ارادہ و خواہش سے خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کی روح کی حیثیت کے موافق جو کہ ابھی ابتدائی درجہ میں ہے۔ اسی قدر کافی ہے۔ مگر حشرات الارض میں ارادہ قوتِ احساس اور اس قسم کے افعال اضطرابی لحظہ بلحظہ ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ جس سے انکی قوتِ غور و فکر اور سوچ سمجھ کا پتہ ملتا ہے ۔

ان حشرات الارض کا جسم اگرچہ چھوٹا سا ہے۔ تو یہ چھوٹا پن اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ کہ انہیں عقل و ذکا مادہ بالکل ہے ہی نہیں۔ قانونِ قدرت الہی میں چھوٹے بڑے کی بحث نہیں ہے وہاں موٹے پتلے ویل مچھلی اور بمشکل دکھائی دینے والا چھوٹا سا پسو سب برابر ہیں۔ دونوں حسب ضرورت زیور عقل و تمیز سے آراستہ کئے گئے ہیں۔ لہذا ذی روح مخلوقات کے ذہن و دل کا اندازہ ان کی شکل و صورت اور جسامت سے نہیں لگ سکتا ۔

پس جانور چونکہ ذی عقل ہیں۔ اسلئے ہمکو جاننا چاہیئے۔ کہ وہ ذی روح بھی ہیں ۔

واضح ہو کہ شیر خوار حیوانات بہ نسبت مچھلی حشرات الارض اور پرندوں کے زیادہ اہل تمیز ہیں۔ مگر اس مقام پر کیا۔ ہم شیر خوار حیوانات کی تمیز اسی درجہ بندی کیساتھ قرار دیں۔ جو ماہرانِ علم خواص الاشیاء نے تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ تمیز مچھلی سے گوشت خوار حیوانات میں ترقی کرتی ہے۔ اور گوشت خوار حیوانات سے موٹے چمڑہ والے جانوروں میں وغیرہ ۔

یہ درجہ بندی سرسری نظر سے ہی بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ دراصل ہمارے پاس ابتک کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے۔ جسکے ذریعہ سے حیوانات کی عقل و تمیز کی پیمائش کیجائے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں۔ کہ زوفائیٹ میں تو روح صرف بیج کی حالت میں ہوتی ہے۔ اور مونگا میں وہ نشو و نما پاتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ مچھلی وغیرہ میں درجہ تکمیل حاصل کرتی ہے۔ اور جب حشرات الارض کے قالب میں داخل ہوتی ہے۔ تو اسکو تھوڑے بہت قوائے ذہنی ملجاتے ہیں۔ جو پرندوں کے جسم میں اچھی طرح ترقی پاتے ہیں۔ اور شیر خوار جانوروں کے قالب میں ان ذہنی قوتوں کو اور بھی ترقی ملتی ہے۔ ہمارا خیال اور قیاس تو یہ چاہتا ہے ۔

اب ہمیں اس سلسلہ کے دوسرے سرے تک پہنچنا چاہیئے۔ کتاب کے آغاز میں ہم کہہ چکے ہیں کہ انسانی روح خاکی قالب سے نکلنے اور حیات ارضی کے ختم ہو جانے کے بعد فوق البشر کے قالب میں نفوذ کرتی ہے جس میں جاکر اسکی اخلاقی اور تمیزی قوتیں اور بھی پرورش پاتی اور ترقی حاصل

کرتی ہیں۔ اگر ہماری یہ رائے صحیح ہے۔ تو اسکے روسے ہمکو حیوانات کا انسان کیساتھ باہمی تعلق قایم کرنا ضروری ہوا۔

اسبات کا ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ ارواح ایک قالب سے دوسرا قالب اختیار کرتی اور بعد ... رہتی ہیں۔ ایک روح جو پہلے زوفائیٹ کے جسم میں تھی۔ اسکے مرنے کے بعد حیوانات کے قالب میں آتی اور یہاں اسکے قوائے ذہنی ترقی پاتے ہیں۔ اسکے بعد وہ مچھلی مچھلی سے حشرات الارض حشرات الارض سے پرندے۔ پرندوں سے شیرخوار جاندار۔ اور شیرخوار جانداروں سے انسانی جسم میں جاتی ہے۔ اور وہاں اسکی قوتیں ایک بڑی حد تک تکمیل حاصل کرتی ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کے بہت سے روحانی بیج ملکر ایک بڑی صورت اختیار کر لیتے ہوں۔ مثلاً بہت سے زوفائیٹ کی ارواح ان کے اجسام کو چھوڑکر ایک ہی مخصوص بڑے وجود کے جسم میں آتی ہوں۔

مگر یہ امر معلوم کرنا کہ انسانی جسم میں کونسے شیرخوار جانور کی روح آتی ہے محال ہے بلکہ یہ بھی نہیں معلوم ہوسکتا۔ کہ وہ روح سلسلہ بسلسلہ بہت سے اجسام میں سے ہوتی ہوئی آتی ہے۔ یا صرف چند جسموں سے گذر کر انسان تک پہنچگئی ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے۔ کہ ہماری روح چار ہاتھ والے حیوانات مثلاً بندر وغیرہ سے گذر کر ہم تک پہنچتی ہے۔ تو یہ بھی صحیح نہ ہوگا۔ اسلئے کہ کئی دوسرے حیوانات تمیز و ادراک میں چار ہاتھ والے جانوروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ چار ہاتھ والے حیوانات میں بالعموم دیکھا گیا ہے۔ کہ بالکل معمولی درجہ کی عقل و تمیز ہے۔ اسپر طرہ یہ کہ وہ عموماً کینہ توز اور شہوت پرست ہیں۔ صرف چند خصوصیات صورتِ انسانی کے سوا ان میں انتہا درجہ کی حیوانی ... ایکل ہوتی ہیں۔ پس ان حالات میں روح کا ان سے گذر کر انسان میں آنا کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

اکثر جانور جو نہایت قوی اور شریف ہیں۔ اس عزت و فخر کے مستحق معلوم ہوتے ہیں۔ کہ انسانی روح کا دوسرا درجہ انہیں عطا کیا جائے۔ یہ جانور دنیا کے آباد حصص میں جداگانہ حالتوں میں رہتے ہیں۔ افریقہ میں شاید شیر اور گیدڑ انسانی جامہ کو پہنتے ہوں۔ اور امریکہ میں شاید گھوڑے اور کتے کو یہ فخر حاصل ہو۔ جو اس سرزمین میں بنی نوع انسان کے بہتر ... اور ... دوست ثابت ہو چکے ہیں۔ زمانہ حال کا ایک مشہور مصنف کتوں کو انسانی حیات کا امیدوار

خیال کرتا ہے۔ اگرچہ اسکو یہ معلوم نہ تھا۔ کہ اُسکی اس رائے میں بہت سی صداقت پائی جاتی ہے؛

اس مقام پر حیوانات سے روح کے انتقال قالب کرتے کرتے انسان تک پہنچنے میں ایک اعتراض پیش کیا جاسکتا ہے۔ کہ کیوں انسان کو اپنی گذشتہ پیدائشوں کی نسبت کچھ بھی معلوم نہیں ہے؟؛

اسکا جواب اسطرح دیا جاسکتا ہے کہ حیوانات میں قوت حافظہ کا وجود قریباً عدم کے برابر ہے۔ نیز خورد سال بچے بھی اس قوت سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ اور پیدائش کے وقت ایک بچّہ کی اور حیوانات کی حالت میں مطلق فرق نہیں ہوتا۔ جب بارہ ماہ پورے منقضی ہوجاتے ہیں۔ اور ذہن کی تکمیل تعلیم سے ہونے لگتی ہے۔ تب اسمیں قوت ادراک نشو و نما حاصل کرتی ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ بچہ میں قوت یادداشت باقی رہے۔ کیا ہمکو شکم مادر میں رہنا یاد ہے؟؛

ہم اُن لوگوں سے اتفاق رائے نہیں کرسکتے۔ جو حیوانات کی قوت ممیزہ ہی سے منکر ہیں؛

زمانہ قدیم کے حکماء حیوانات میں قوت مدرکہ موجود ہونے کے قائل ہیں ارسطو اور افلاطون اس معاملہ میں صاف طور سے لکھ گئے ہیں۔ اور زمانہ موجودہ کے مشہور فلاسفر لاک مانٹسیئن اور لیبنٹز صاحبان بھی حیوانات کی قوت ممیزہ کو مانتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ڈسکارٹیز اور بعض دیگر صاحبان کو اسقدر اختلاف رائے کیوں ہے؟؛

ڈسکارٹیز صاحب کا مقولہ ہے کہ حیوانات محض ایک کل ہیں۔ مگر ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔ کہ حیوانات کل کسطرح قرار دئے جاسکتے ہیں؟ یہ سراسر ایک فضول اور بیہودہ بات ہے؛

ہاں اسمیں شک نہیں کہ نسبتاً حیوانات میں قوت ممیزہ کم ہوتی ہے۔ سو اسکی وجہ یہ ہے کہ انکے لئے اسی قدر قوت کافی ہے کیونکہ انکی ضروریات بھی کم ہیں۔ انکے ہوش و حواس زیادہ ترقی نہیں کرتے۔ اسلئے کہ انکے کام کرنے کا دائرہ تنگ ہوتا ہے؛

مگر اکثر موقعوں پر دیکھا گیا ہے۔ کہ انسان جہالت اور حیوانیت میں حیوانات پر بھی سبقت لے جاتا ہے؛

ہمارے مذکورہ اصول کے بموجب بھی روح حیوانی ترقی کرتے کرتے وجود اعلےٰ تک پہنچ جاتی ہے؛

باب اوّل میں ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ موت آخری منزل گاہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک جائے تیاری

ہے صرف حالت میں تغیر ہوتا ہے۔ اب اس مقام پر ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ پیدائش بھی ابتدا نہیں ہے۔ بلکہ ایک نتیجہ ہے۔ آغاز ہستی کا نام پیدائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی سابقہ کے تسلسل کو جاری رکھتا ہے ؛

بدیں وجوہ ثابت ہوگیا۔ کہ انسان کیلئے نہ تو موت ہے نہ پیدائش۔ زندگی صرف ایک غیر منقطع سلسلہ ہے۔ جو ظاہری عالم اور باطنی عالم کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اسکے ساتھ وہ عالم وابستہ ہیں جنہیں ہم ان ظاہر بین آنکھوں سے کسی طرح نہیں دیکھ سکتے ؛

فصل دوازدہم

فلاسفر لینیس کا مقولہ ہے کہ نباتات صرف ذی حیات ہیں۔ اور حیوانات ذیحیات ہونے کیساتھ ہی ذی حس بھی ہیں۔ اور انسان ذیحیات و ذیحس تو ہے ہی۔ اس میں ساتھ ہی قوت متخیلہ بھی ہے ؛

لینیس کا یہ مقولہ سابقہ سائنس کی بنیاد پر ہے۔ مگر زمانہ حال میں سائنس نے بہت کچھ ترقی کی ہے۔ ۱۸۳۵ء سے بہت سے عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں۔ اور اب لینیس صاحب کا مذکورہ بالا خیال اصلاح طلب ہے۔ چنانچہ اگر اب لینیس صاحب کے جملہ کو اسطرح کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ نباتات صرف ذیحیات و ذی حس ہیں۔ اور حیوان و انسان میں حیات و حس کے علاوہ قوت متخیلہ بھی ہے ؛

گو نباتات کو ذی حس بتانا قانون تاریخ قدیم میں دخل دینا ہے۔ مگر ادقات کی موجودگی میں ہم ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور چار و ناچار آجتک کے ظاہر شدہ تجربہ کو اس مقام پر درج کرتے ہیں ؛

اوّل۔ نباتات کو تکلیف و آرام کا احساس ہے۔ اسکا ثبوت یہ ہے کہ موسم سرما میں وہ سکڑنے لگتے ہیں۔ درخت موسم سرما میں گرمی کے بالکل کم ہو جانے کیوجہ سے کانپتا ہے۔ اور پھر جب دوسرے موسم میں وہی گرمی اعتدال سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ تو اسکے پتے نیچے کی جانب لٹک جاتے اور اینٹھکر خشک ہونے لگتے ہیں۔ مگر شام کے وقت پھر ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے انہیں شگفتگی آجاتی ہے۔ اور وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسوقت درخت گویا اپنی تندرستی کا اظہار کرتا ہے۔ موسم خزاں سے بھی اسکو تکلیف ہوتی ہے۔ اور قدرت کے خلاف

کرنیوالے اہل نظر واقف ہیں - کہ خزاں کے بعد موسم بہار میں جب درختوں کو پانی ملتا ہے تو وہ کسقدر خوش اور شاداب ہوتے ہیں - نیز ان صاحبان کو یہ معلوم ہے کہ شاخ قلم کرنے سے درختوں کو کسقدر تکلیف پہنچتی ہے جس طرح انسان کے کسی عضو کے قطع ہو جانے کے بعد عرصہ تک خون جاری رہتا ہے - اسی طرح درخت سے بھی اسکی شاخ قلم ہونے کے بعد ایک قسم کی رقیق رطوبت خارج ہوتی ہے ؛

درخت بیمار بھی ہوتے ہیں - اور اگر انکی بیماری کا مناسب علاج نہ کیا جائے - تو مرجاتے دسوکھ جاتے ہیں - اہل شوق پھولدار درخت سے غنچہ یا پھول کا توڑنا برا جانتے ہیں - وہ انکو توڑ کر پامال کرنے سے صرف اسکی خوشبو سونگھنے اور ان کی رنگینی و خوشنمائی دیکھنے کو بہتر سمجھتے ہیں ؛

کل نباتات میں ایک سی کیفیت پائی جاتی ہے - اگر وہ کسی درد انگیز سامان سے متقابل ہوتے ہیں - تو ان کے پتے ضرور مرجھا جاتے ہیں - اور شیر دار درخت کا سر املدینے سے عرق نکل آتا ہے ؛

حیوانات کو ذی حس ہونے کے جو حقوق حاصل ہیں - وہی نباتات کو بھی ہیں بجلی سے جانوروں کیطرح درخت بھی مرجاتے ہیں - زہروں کا اثر موت یا بیہوشی کیلئے جیسا کچھ حیوانات پر پڑتا ہے - ویسا ہی درختوں پر بھی ہوتا ہے - اگر پانی میں افیون گھولکر درخت کی جڑ میں ڈالدو - تو اسکو بھی نشہ ہوتا ہے - لطف یہ کہ اگر عرصہ دراز تک اسی طرح افیون ڈالتے رہو - اور پھر ڈالنا چھوڑ دو - تو وہ درخت خشک ہو جاتا ہے - ایم کیورٹ صاحب عالم علم نباتات نے تجربہ کیا ہے - کہ ہائیڈروسینک ایک قسم کا زہر حیوانات کیطرح نباتات کو بھی نہایت عجلت کے ساتھ ہلاک کر دیتا ہے ؛

دوم - نباتات بھی حیوانات کیطرح شب کو آرام کرتے اور سوتے ہیں - تو انکی قوتیں دن کو تو ترقی حاصل کرتی رہتی ہیں - مگر جہاں شب کی تیرگی پھیلی اور انکے پتوں کی کیفیت بدلی - وہ آرام کرتے وقت قدرے سکڑ جاتے ہیں - دن بھر پتوں کا رُخ اوپر کی طرف کو رہتا ہے - اور سطح زیرین زمین کی جانب - وہ انہی سوراخوں کے ذریعہ سے نمی کو جذب کرکے کاربن کو خارج کرتے ہیں - بالائی سطح میں زیرین سطح کی طرح سوراخ نہیں ہوتے ہیں - دن کو پتوں کا اس طرح قائم رہنا اس امر کا ثبوت ہے - کہ وہ دن بھر زندگی کے کام کاج میں لگے رہتے ہیں -

مگر رات کو جو وہ سکڑ جاتے ہیں۔ تو اس وقت کوئی کام نہیں کرتے۔ اور ہماری طرح آرام میں رہتے ہیں ؛
یہ بات عام ہے۔ ایسے درخت بہت کم ملینگے۔ جنکے پتے شب کے وقت مرجھا نہ جاتے ہوں۔ اس امر میں لاجونتی سب سے اعلےٰ مرتبہ رکھتی ہے۔ تاہم یہ حالات تمام نباتات میں جنکے پتے ملایم ہوتے ہیں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ اب ہم ایک رائے کا اقتباس درج کرتے ہیں جو ایک بڑے فاضل شخص نے مضمون زیر بحث پر دی ہے۔ پودے بالکل حیوانات کی طرح سوتے ہیں اور سوتے وقت اپنے عالم بچپن کی طرح بستہ اور منہ بند ہو جاتے ہیں۔ یعنی ناشگفتہ کلیوں کی مانند پتے سمٹ جاتے ہیں۔ ایک صاحب نظر خیال کر سکتا ہے۔ کہ ہر رات کو پودوں کے تئیں اپنے اپنے سیلنے کا دھیان رہتا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں وہ شکم مادر میں بصورت تخم تھے" ؛

سوم۔ حیوانات اور نباتات سے زندگی کے متعلق بہت سی کارروائیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ طبقہ حیوانات تو انسانی رائے کے نزدیک ذی حس مانا جاتا ہے۔ اور بیچارے نباتات غیر ذی حس فرض کر لئے گئے ہیں۔ متقدمین میں سے ایک فلاسفر درختوں کو "جڑ والے ذی روح" کا خطاب دیتا ہے۔ اس مقام پر ہم اس دور اندیش کی رائے کا موازنہ کرتے ہیں۔ کہ وہ کہاں تک درستی پر ہے؟ ؛

کل قوتوں میں حیوانات و نباتات برابر ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ نباتات میں وہ ایک محدود حالت میں ہیں۔ مثلاً سانس لینے کی صورتیں ہر دو مخلوق میں مساوی ہیں۔ حیوانات نفس کشی کے بعد صرف آکسیجن کو جذب کرتے۔ اور کاربونک ایسڈ گیس اور بخارات آب کو خارج کرتے ہیں۔ اور نباتات سب کے وقت کاربونک ایسڈ اور آبی ابخرات کو خارج کرتے ہیں۔ اور دن میں شعاع آفتاب کے اثر سے کاربونک ایسڈ کو داخل اور آکسیجن کو خارج کرتے ہیں۔ پس طرز عمل دونوں مخلوقات کا بالکل یکساں ہے ؛

حیوانات کے جسم سے پسینہ نکلتا ہے۔ اور نباتات کے جسم سے عرق خارج ہوتا ہے۔ پتے کی پچھلی سطح پر پانی چھڑکا کیجئے تو معلوم ہو کہ وہ کس طرح جذب کرتے ہیں۔ پھولوں کے گلدستوں پر پانی چھڑک کر پھر دیکھو کہ ان میں کسقدر شگفتگی آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نباتات میں حیوانات سے بھی زیادہ قوت جاذبہ موجود ہے۔ اگر آپ نباتات کے اندرونی حصہ میں باریک نالیاں ہوتی ہیں۔ جنسے غذا اور پانی انکے ہر ایک حصہ میں پہنچ جاتا ہے۔ بھلا آپ بتلایئے کہ حیوانات میں یہ بات کہاں ہے؟ ؛

پس ظاہر ہے کہ ان امورات میں حیوانات و نباتات کا ایک ہی درجہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمیں ہنوز نباتات کے حواس کا کافی علم حاصل نہیں ہوا۔ یہ امر بہت ہی تعجب اور اسکے ساتھ ہی غور کے بھی قابل ہے۔ کہ حیوانات کے معاملہ میں تو ہمارا علم اسقدر وسیع ہو۔ اور نباتات کے بارہ میں تصدیق کا محتاج سمجھا جائے؛

انسان اور حیوانات میں غذا کے ہضم اور تحلیل ہونے کے طریقے ہمکو بخوبی معلوم ہیں ہم جانتے ہیں۔ کہ عروق کے ذریعہ سے غذا انسانی اعضا میں پہنچ جاتی ہے۔ ہم ان عروق کو جو آلہ حس و حرکت ہیں چھوا اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔ اور ہمکو یہ بھی معلوم ہے کہ حس کی رگ کونسی ہے اور حرکت کی کونسی؟ ہمکو انسان و حیوان میں رگوں کے دو مختلف فرائض ہونے کی بھی خبر ہے۔ اور یہ بھی کہ ان سب کی سکونت دماغ میں ہے۔ مگر نباتات کی نسبت انہیں سے بہت کم باتوں کی خبر ہے؛

افسوس ہے کہ ہم اپنے علم کے محدود ہونے کیوجہ سے اس مسئلہ پر زیادہ بحث کرنے سے قاصر ہیں۔ اور اسی لئے کوئی نتیجہ بھی نہیں نکال سکتے؛

چہارم۔ نباتات ہو یا حیوانات۔ تولید و تناسل طریق اور اسکے ذرائع دونوں میں موجود ہیں۔ بلکہ بعض بعض نباتات کی بار آوری تو بالکل حیوانات سے مشابہ ہے۔ حتےٰ کہ ان میں نر و مادہ کے آلہ تناسل تک موجود ہوتے ہیں۔ بالکل حیوانات کیطرح ہی نباتات کے نر کے آلہ تناسل میں سے مادہ کے آلہ تناسل میں مادہ تولید (تخم) قرار پکڑتا ہے۔ اور نباتات کے بیضے بھی حیوانات کی طرح امتداد زمانہ اور حرکت سے پرورش پاتے ہیں؛

نباتات کی حرارت کا بھی اندازہ ہو چکا ہے۔ آلہ مقیاس الحرارت سے پودوں میں گرد کی ہوا کی نسبت ایک دو درجہ کی گرمی زیادہ پائی گئی ہے۔ درحالیکہ عوام اس خیال سے کہ نباتات میں رطوبت ہوتی ہے۔ ہوا کی نسبت انہیں سرد سمجھے ہوئے ہیں؛

فرمائیے کہ اب یہ کس طرح مانا جا سکتا ہے۔ کہ نباتات میں جب بار آوری کے وقت ہیجان ہوتا ہوگا۔ تو وہ حس سے خالی ہوتے ہونگے جیوانات کی طرح نباتات کے ہیجان اور جوش کے بھی خاص ایام ہیں۔ کیا یہ امر قابل پذیرائی ہے۔ کہ وہ اس جوش کے احساس سے محض بیخبر اور ناواقف ہونگے؟۔ کیا ہمکو یہ مان لینا چاہیئے۔ کہ ہیجان کے وقت گرم ہو جانے والے نباتات۔ جمادات کی مانند بالکل غیر حس ہیں؟؛

ہم اس رائے سے ہرگز اتفاق نہیں کر سکتے۔ زندگی سے حس کا علیحدہ ہونا سراسر

ناممکن ہے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں ؛

دریائے راتموں کے پانی میں اس قسم کے پودے پائے گئے ہیں جنہیں نر و مادہ کے آلہ تناسل موجود ہیں۔ وہ ان پودوں کی شاخوں میں ہوتے ہیں۔ مادہ پھول بل کھائی ہوئی لمبی شاخوں میں زمین سے لگے رہتے ہیں۔ مگر جب بارآوری کا موسم آتا ہے۔ تو ان شاخوں کے پیچ خودبخود کھل جاتے ہیں۔ اور وہ سطح آب پر پھیل جاتی ہیں۔ نر پھول مادہ پھول کی طرح ملائم شاخ تو نہیں ہوتے۔ کہ سطح آب تک آسکیں۔ بس اوپر ہی شگفتہ ہوکر پھوٹ جاتے ہیں۔ اور سطح آب پر مادہ کے ادھر ادھر بہنے لگتے ہیں۔ اسکے بعد تموج آب سے نر پھول تو ادھر ادھر بہ جاتے ہیں۔ اور مادہ پھول اپنے بیج کو لپیٹ کر پھر پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور اندر ہی اندر حمل کے بیج پختگی پاتے ہیں ؛

ایک قسم کے پودے فینرو گیمس نامی ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف آلہ تناسل کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ قلم لگانے سے بھی پیدا ہوجاتے ہیں ؛

دوسری قسم کے پودے پڑگیمس نامی ہوتے ہیں۔ جنکے آلہ تناسل نہیں ہوتے۔ اسکے بیج زمین پر گرتے اور نشوونما حاصل کرتے ہیں ؛

اور اکثر پودوں کے تو ٹکڑے اور پتے ہی گر کر پیدا ہوجاتے ہیں ؛

اسیطرح طریق پیدائش حیوانات میں بھی محدود نہیں ہے۔ وہ صرف انڈوں اور بچوں ہی کی شکل میں پیدا نہیں ہوتے۔ بلکہ نباتات کی مانند شاخ اور پیوند سے بھی انکے بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ پانی سے تازہ نکلا ہوا کیڑا جسکا نام پالپ ہے۔ نباتات کیطرح شاخ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس جانور کے اندرونی حصے سے چھوٹی چھوٹی گانٹھیں سی نکلتی ہیں۔ جو بڑھتی اور لمبی ہوتی جاتی ہیں۔ جب ایک گرہ لمبی ہوتی ہے۔ تو دوسری کو خارج کردیتی ہے۔ اور پھر اس نئی گرہ سے ایک اور گرہ نکل آتی ہے۔ اور یہ کل چھوٹے چھوٹے پالپ اپنی غذا کو بڑے پالپ ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جب انکی مقدار اصلی اور پوری ہوجاتی ہے۔ تو یہ بہت سے نئے پالپ بنجاتے ہیں۔ اسیطرح مونگے کا کیڑا بھی بڑھتا ہے۔ ایک بڑی شاخ سے چند شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ انکی شکل پہلے غنچہ کی سی ہوتی ہے۔ اور یہی شاخیں بڑی بڑی شاخوں سے مل ملاکر منفرد مونگے بنجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مونگے کی ظاہری صورت بجائے حیوانوں کی ہونے کے جھاڑ دار درخت کی مانند ہوتی ہے ؛

ڈریپوس نامی دوسرا نباتاتی کیڑا بھی جو بظاہر درخت کی مانند ہوتا ہے اور جسے لوگ مدتوں درخت ہی سمجھتے رہے ہیں۔ مونگے کی مانند پیدا ہوتا ہے ؛

اکثر کانٹے سے بھی کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پالپ ہی کے خواہ کتنے ہی حصے کرلو۔ یہ کل حصے علیحدہ علیحدہ جانور بنجائینگے۔ اور پھر ان نئے کٹے ہوئے کیڑوں سے اسیطرح اور نئے پالپ بنجائینگے۔ اور نہ صرف انکے حصّوں پر نئے جانوروں کی پیدائش کا مدار ہے بلکہ اسکے پوست سے بھی نئے پالپ بنجاتے ہیں ؛

حیوانات میں بھی نباتات کی طرح پیوند چڑھ جاتا ہے۔ اگر بہت سے پالپ لیکر ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں۔ اور انکے سروں کو زنجیر کی کڑیوں کی مانند باہم ملا دیا جائے۔ تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو غذا دیتے دیتے انجام کار سب کے سب ایک ہی ہو جائینگے ؛

پنجم۔ حیوانات اور نباتات میں اور بھی بہت سی مشابہتیں ہیں۔ ایک تو ان میں حیرت انگیز تولید و تناسل کی مشترکہ خاصیت ہے یعنی ایک جانور سے ہزاروں جانور اور ایک درخت سے ہزاروں درخت پیدا ہو سکتے ہیں۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا۔ کہ تولید کے معاملہ میں نباتات کا درجہ حیوانات سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ درخت سے برس کے برس پیدائش ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ سلسلہ بعض اوقات سو سو برس تک قایم رہتا ہے۔ مگر جانوروں میں خواہ وہ شیر خوار ہوں یا پرندیا حشرات الارض۔ بھلا یہ بات کہاں ہے؟ وہ نسبتاً بہت کم پیدا کرتے ہیں۔ اور وہ بھی تھوڑی سی عمر تک۔ درختوں میں ایک درخت۔ الم نامی ایسا ہے۔ جو سال میں تین لاکھ بیج پیدا کر سکتا ہے۔ اور اسکی یہ قوّتِ تولید و تناسل برابر سو برس تک قایم رہتی ہے حیوانات میں البتہ صرف مچھلی اور چند حشرات الارض پیدائش کے باب میں درختوں کے قریب قریب پہنچتے ہیں۔ کیونکہ ایک سال میں تنچے مچھلی دس ہزار اور کارٹ مچھلی بیس ہزار انڈے دیتی ہے ؛

اب ان مچھلیوں کیساتھ مقابلہ کرنے کو ہم خشخاش اور رائی کے درخت کو پیش کرتے ہیں۔ جو بے تعداد بیج پیدا کرتے ہیں ؛

اس بیان سے ہمارا مطلب دونوں جنس کی کثرتِ پیدا وار کا دکھانا تھا۔ اب ذرا انکے قد و قامت کا بھی خیال کر لیجئے۔ دونوں میں طویل اور صغیر جسم موجود ہیں حیوانات میں ویل مچھلی اور ہاتھی وغیرہ کو اور نباتات میں برگد کو دیکھئے۔ جو ایک عظیم الشان درخت ہوتا ہے اور کئی سو مربع زمین تک کو اپنے سایہ میں گھیر تا ہے۔ یہ عالم انکی بڑائی کا ہے چھوٹے

کے لحاظ سے بھی ان میں مشابہت ہے۔ دونوں میں ایسے بہت سے وجود ہیں۔ جو بغیر خوردبین کے دکھائی ہی نہیں دیتے ؛

حیوانات ونباتات ایک ہی جگہ رہتے۔ پرورش پاتے اور ایک ہی مقام پر ایسی زندگی بسر کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا دونوں ایک دوسرے کی امداد کیواسطے پیدا کئے گئے ہیں ؛

حیوانات ونباتات کے پیدائش کیلئے خاص خاص مقامات مخصوص ہیں۔ یہ اودیات سے کروہ انسانی دسترس کا ہی سے پہاڑی اور جھاڑیاں سے ہر مقام پر پیدا کئے جا سکتے ہیں ؛

حیوانات اور نباتات دونوں میں ایسی اجناس ہیں۔ جو صرف ہوا اور پانی ہی میں نشو ونما حاصل کر سکتی ہیں۔ مثلاً حیوانات میں مینڈک۔ اور نباتات میں شرپچن وغیرہ ؛

حیوانات اور نباتات دونوں سے پیرا ذائیٹ پیدا ہوتے ہیں مثلاً حیوانات میں تو جوں کھٹمل پسو اور نباتات میں لیپن وغیرہ غرضیکہ تقریباً کل باتوں میں حیوانات ونباتات مشابہ ہیں۔ پھر معلوم نہیں کہ ایک کو ذی حس اور دوسرے کو غیر ذی حس کیوں اور کس وجہ سے مانتے ہیں ؛

ششم حیوانات کی طرح نباتات بھی بیمار ہوتے ہیں مثلاً اگر کسی پودے کو کسی گرم جگہ سے سرد جگہ لیجائیں۔ تو وہ بیمار ہو کر فوراً مرجاتا ہے ؛

ہفتم بیماری یا کسی اور وجہ سے حیوانات ونباتات کی شکلوں میں اگر بگاڑ عارض ہو جاتی ہے۔ تو وہ علاج کرنے سے دور ہو سکتی ہے ؛

ہشتم۔ بڑھاپا اور مرنا خواہ نباتات ہو یا حیوانات سب کے لئے لازمی ہے۔ چنانچہ دیکھئے استدر ازمانہ سے درخت اسقدر سخت ہو جاتے ہیں۔ کہ پانی تک جذب نہیں کر سکتے۔ اور روز بروز کمزور ہو کر انجام کار مرجاتے ہیں ؛

اب جبکہ حیوانات ونباتات کا تخیلی مقابلہ ہو گیا۔ تو ہم اسکے درمیان حد بندی کرنے سے عاجز ہیں ؛

کبھی وہ دن تھے کہ لوگ حرکت ارادی کو صرف حیوانات ہی تک مخصوص کرتے تھے۔ اور نباتات کو اس سے محروم سمجھتے تھے۔ مگر اب ایسے بھی درخت پائے گئے ہیں۔ جو عنکبوت کی مانند لکڑی کو پکڑ کر جذب کر لیتے ہیں ؛

کئی درختوں کے آلہ تناسل میں حیوانانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اور انہیں حرکت

ارادی ہوتی ہے۔ یہ عجیب و غریب مخلوقات کبھی پانی کے اندر بہتی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی زمین پر [illegible]
باہر نکل آتی ہے۔ بسا اوقات غاروں میں چھپ جاتی ہے۔ پھر [illegible] ہو جاتی ہے۔

جرمنی کے ایک عالم علم نباتات نے ان درختوں کی حرکت ارادی کو معلوم کر کے لکھا
ہے کہ یہ حیوانی زندگی کی مانند قوت حس و حرکت رکھتے ہیں۔ اگرچہ [illegible] نشو و نما حاصل
کرتے ہیں۔ اس لئے پودے معلوم ہوتے اور علی العموم درختوں کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

ایک اور مشہور سائنس دان پاوچٹ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اکثر نباتاتی کیڑوں
کے اندر قوت حس موجود ہوتی ہے۔ وہ اپنے بازوؤں کی مدد سے اکثر پانی پر پھرا کرتے ہیں۔ ان
کیڑوں میں بعض بلحاظ شکل و صورت جونک سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ انکے سر دولتوں
کے ذریعہ سے پودے سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور وہ حرکت کرتے رہتے ہیں۔ بعض
مینڈکوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ جو کائی کے سوراخوں میں پھدکتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔"

ان کی حس و حرکت کا مسئلہ اب بہت صاف اور صریح ہو گیا ہے۔ خوردبین کی مدد سے
بخوبی معلوم ہو گیا ہے۔ کہ وہ اس تیزی سے جست و خیز کرتے ہیں۔ جس طرح کوئی نٹ بانس
اور رسی پر اچھلتا ہے۔

معلوم نہیں پھر علماء نباتات کو کس لئے بےحس و حرکت بتلاتے ہیں۔ کیا بعض فلسفیوں
کو آنکھیں اسی غرض سے دی گئی ہیں۔ کہ وہ ان سے دیکھ نہ سکیں۔

ہماری رائے میں یہ کل متحرک نباتات اور تقریباً تمام زوفائیٹ۔ مونگا۔ مڈریپور۔
پولزر وغیرہ جو سطح ارض پر موجود ہیں۔ حیوان کہلانے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ حرکت ارادی ان میں
بھی پائی جاتی ہے۔ ان خصوصیات کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ آیا ہم انہیں حیوانات کہیں
یا نباتات؟

پہلے پہل مدت تک لوگوں کو پالپ کی تحقیقات میں دقت پڑی کہ اسے نباتات
سمجھیں یا حیوانات؟ لطف یہ ہے کہ جب وہ [illegible] اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سب جڑ جڑ
کر پھر ایک جانور بن جاتا تھا۔ تو بھی بعض حضرات اسے نباتات [illegible] شامل کرتے
تھے۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کیڑوں کو پکڑ کر کھا جاتا ہے [illegible]
حیوانات میں شامل کرنا پڑا۔

پالپ میں ایک اور بھی حیرت انگیز بات ہے کہ خواہ [illegible]

کو الٹ دو۔ اِس سے اسکی زندگی میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ وہ تب بھی جیتا رہیگا۔ پرورش پائیگا۔ اور اِس سے اولاد بھی پیدا ہوگی۔ جب سائینس داں اصحاب نے اسمیں یہ عجیب خصوصیت ملاحظہ کی۔ تو انہیں اس حیوانی دنباتاتی سلسلہ میں ایک ادنیٰ اور درمیانی کڑی کی جستجو کرنی پڑی۔

ہمنے پچھلے صفحوں میں حیوانات اور نباتات کی درجہ بندی کی ہے۔ مگر واضح ہو کہ یہ درجہ بندی قدرت اور قانون قدرت کی مقررہ نہیں ہے۔ بلکہ انسانی سائینس نے اسے تجویز کیا ہے۔

حاصل کلام جہانتک واقعات سے تعلق ممکن تھا ہم ثابت کر چکے ہیں کہ نباتات بھی حیوانات کی طرح ذی حس ہیں۔

آئیے اب ہم آپکو ایک اور منظر دکھائیں۔ سمندر میں طوفان بلاخیز بپا ہے۔ اسکے کناروں پر ایک تناور درخت کھڑا ہے۔ چند قدم کے فاصلہ پر ایک مچھلی پانی کے تھپیڑے کھاتی کھاتی باہر آپڑی ہے۔ ان سے تھوڑی ہی دور سطح آب پر اسفنج۔ مونگا یا گھونگے وغیرہ پیر رہے ہیں۔ برف کی باد خنک جو دل کو ٹھٹھرائے دیتی ہے۔ نہایت تندی کیساتھ چل رہی ہے۔ باد تند کے جھونکے سمندر کی پُرغضب لہروں کو بانسوں اُچھال دیتے ہیں۔ اب دیکھنا چاہیئے۔ کہ اس طوفان بلاخیز سے خوف کی علامات آیا نباتات میں پیدا ہوتی ہیں یا حیوانات میں؟

دیکھئے اس طوفان میں اسفنج۔ مونگا اور مچھلی وغیرہ تو اسی طرح پتھر کی مانند بےحس و حرکت پڑے ہیں۔ مگر وہ تناور درخت شدت خوف سے تھرا رہا ہے۔ اسکا عضو عضو کانپتا ہے۔ وہ اپنی تمام شاخوں کو جھکا کر طوفان کے کمرشکن تھپیڑوں سے بچنے کی امید میں اپنے پتوں کو سکیڑ لیتا ہے۔ اگر ذرا بھی تم اسکی حالت کو دیکھلو۔ تو فوراً موسم کی خرابی کے حال سے آگاہ ہو جاؤ۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ تم اس وقت بھی نباتات کے ذی حس ہونیکا اعتراف نہ کرو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسپر بھی تم اسکو غیر ذی حس ہی کہے جاؤ؟ نہیں اسوقت تم شائد اسے ذی حس اور برعکس اسکے مچھلی۔ اسفنج وغیرہ ذی روح جانوروں کو غیر ذی حس کہہ اٹھوگے۔

جس پالپ کا ذکر ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اگر تم پانی کے قریب کھڑے ہو کر اسے دیکھو۔ تو اس زوفائیٹ کو سیوار وغیرہ سے علیحدہ نہ کرسکو۔ بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ انہیں

قریبًا ایک انچ یا اس سے کچھ کم لمبا ایک جھلی کا نل لگا ہوا ہے۔ یہ ذی روح ٹہنی وہاں لگی ہوئی ہے۔ خفیف خفیف سی حرکت اسمیں ہوتی ہے۔ اِس سے نل کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو لمبا ہوجاتا ہے۔ اور کبھی کبھی سکڑ کر چھوٹا سا نیچا تاہے۔ اِس حرکت کے ذریعہ سے وہ آبی جانوروں کو جو اسکے نزدیک سے گذرتے ہیں۔ پکڑ لیتا ہے۔ کیا یہ فعل اسکی حیوانی زندگی کی دلیل نہیں ہے؟ بالکل اسی طرح مچھلی پکڑنے والا درخت ہے۔ جو مچھلیوں کو پکڑ کر کھا جاتا ہے۔

سمندر کی تہ میں ایک عجیب و غریب قسم کا زوفائیٹ ہوتا ہے جس کا نام اکٹینم ہے۔ مدتوں تک یہ نباتات میں شمار ہوتا رہا ہے۔ اسوقت اسے گل سمندر کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اِسے پیرس کے ایک باغ کے حوض میں لگا یا گیا تھا۔ یہ اپنے سر کی کلغی کو جو پھول کے مشابہ ہوتی ہے۔ (جس کی وجہ سے اِس کا نام گلِ سمندر مشہور ہوگیا) خوب ہلایا کرتا تھا۔ یہ پھول بھی نباتات کو ذی حس ثابت کرتا ہے۔

چارلس بانٹ صاحب اس مسئلہ پر یوں رائے زن ہیں "قدرت میں تمام اشیاء بتدریج ترقی پاتی ہیں۔ نباتات کو غیر ذی حس خیال کرنا گویا سلسلہ قدرت میں ایک چھلانگ مارنا ہے اور وہ بھی اسطرح جس میں معقولیت نام کو نہیں ہے"۔

چارلس بانٹ صاحب نباتات کو ذی حس مانتے ہیں۔

ہمارے اس اصول کے بموجب نباتات ذی روح ہے۔ بات یہ ہے کہ مادہ روح آفتابی شعاعوں کے ذریعہ سے پہلے پانی میں آتا ہے۔ اور وہاں سے نباتات اور زوفائیٹ کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ زوفائیٹ کو صرف قوتِ حس ہے۔ مگر مچھلی اور حشرات الارض کو علاوہ قوتِ حس کے توجہ کی قوت بھی عطا ہوئی ہے۔ غرض حیوانات جوں جوں درجہ بدرجہ ترقی پاتے ہیں توں توں ان میں روحی تکمیل بھی ہوتی جاتی ہے۔

اِس سلسلہ کے معراج کمال پر انسانی جسم ہے۔ جب روح یہانتک پہنچ جاتی ہے۔ تو اسمیں ہشیار قوتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ جو حیوانات میں دبی رہتی تھیں۔ اور جنہیں ظاہر ہونے کا کبھی موقعہ نہیں ملا تھا۔

جب حیوانات میں ہم قوت حس مانتے ہیں۔ تو گویا قدرت کے سلسلہ مخلوقات کی کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش عین قانون قدرت کے مطابق ہے۔ اور اسمیں ہمیں پوری کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

فصل سیزدہم

باب ماسبق میں کچھ اس امر پر بحث کی گئی ہے جس سے صرف کرۂ زمین ہی کا آباد ہونا ثابت ہوتا ہے ۔

گذشتہ صدی کے اختتام تک لوگوں کو یہی یقین تھا۔ اور وہ صرف زمین ہی کو آباد کرہ سمجھے ہوئے تھے ۔

مگر اب علوم جدیدہ نے اس غلط قیاس کی اچھی طرح تکمیل کر دی ہے۔ گو اس امر کے ماننے میں کہ زمین مدامی گردش کر رہی ہے۔ اور بخلاف اسکے آفتاب ہر وقت ایک ہی جگہ قیام پذیر ہے. ظاہری حواس خمسہ کے برخلاف بہت کچھ کشمکش کی ضرورت پڑی ۔ ان کرّوں کی جو شب و روز گردش کرتے رہتے اور وسیع آسمان کی نیلگوں چھت پر درخشاں اور تاباں نظر آتے ہیں حیثیت اور فرائض کی بابت آگہی حاصل کرنے میں ہمیں قدما اور سلفا کے مشاہدات اور سائنس کی امداد کی ضرورت پڑی ہے۔ اس لئے اس میں ذرا بھی تعجب نہیں ہے۔ کہ ان کے معلوم کرنے اور سمجھنے میں انسان نے ایک مدت دراز صرف کی اور وہ ہزاروں برس تک ان سیاروں کی نسبت بچوں ہی کے سے خیالات اور منصوبے باندھتا رہا ۔

علماء یونان و مصر و روم وغیرہ کا علم صرف سطح ارض تک ہی محدود رہا۔ اسمیں شک نہیں۔ کہ مشرقی علماء وسیع علوم کے ذخائر کے مالک تھے۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کن کن ذرائع سے ان علوم کو حاصل کرتے تھے۔ حکماء سلف کو صرف یورپ۔ ایشیا اور شمالی افریقہ کے جغرافیہ کا علم تھا۔ مذہب عیسوی نے بھی انہیں کی تقلید کی۔ اور ان کے نقش قدم پر قدم رکھتے ہوئے صرف زمین ہی تک دائرہ علم کو محدود رکھا۔ اسلئے کہ زمین کے علاوہ ان بیچاروں کو اور کسی چیز کی خبر ہی کب تھی؟ زمین ہی ان کی دنیا و جہان تھی اور بس ۔

ستاروں کی بابت خیال تھا کہ یہ سونے چاندی کی [illegible] فلک کے نیلگوں گنبد میں جڑی ہوئی ہیں۔ اور انکا کام صرف شب [illegible] آسمانی چراغ ہے۔ اور آفتاب آسمان کی نورانی سڑک پر چلتا پھرنے والا مسافر قدرت۔ آفتاب و ماہتاب کی جسامت میں بڑے چھوٹے پن کا کوئی فرق نہ مانا جاتا تھا۔ اور چاند اور سورج کے بالائی طبقات کو اکثر مذاہب بہشت کا نام دیتے تھے۔ وہ مقام نورانی اور ابر آلودہ

رہتا تھا جسمیں خدا کی برگزیدہ مخلوق جا جا کر آباد ہوتی تھیں۔ اور زیر زمین نہایت گہرے غار اور شگاف تھے جنمیں گنہگار انسان قید کئے جاتے تھے ؛

ابتدا میں دُنیا کی نسبت عوام کا یہی خیال تھا۔ دونوں نصف کروں کے وحشی بلکہ مصریوں۔ یونانیوں۔ رومیوں اور دیگر مشرقی ممالک کے باشندوں تک کا بھی یہی خیال تھا ؛

مگر جدید علم ہیئت نے قدیم آسمان کو روئی کے گالے کی طرح اڑا کر غائب کر دیا۔ اور دنیائے ارضی کے تمام لمبے چوڑے استحقاق چھین گئے۔ یا تو وہ ایک واحد دنیا مانی جاتی تھی۔ یا اب ہر ایک کرہ دنیا سمجھا جانے لگا۔ اور ہماری دنیا کی نسبت خیال ہوگیا۔ کہ انگنت کروں میں یہ بھی بحیثیت ایک کرہ کے قایم ہے ؛

ناظرین سوال کرسکتے ہیں کہ یہ سیارے کیا چیز ہیں؟۔ اگر ہم انہیں دیکھنا چاہیں۔ تو انکا دیکھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بعض سیارے شام کے وقت کسی خاص مقام پر دکھلائی دینگے۔ مگر چند گھنٹے بعد انتقال مکان کرکے کہیں سے کہیں جا پہنچینگے۔ اور اگر کسی بڑی دوربین سے دیکھا جائے۔ تو ان کی حرکت تک بھی نظر آتی ہے ؛

ان تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان میں متحرک اور قایم دو طرح کے ستارے ہیں جو قایم ہیں۔ انہیں ستارے کہتے ہیں۔ اور جو متحرک ہیں۔ انہیں سیارے۔ ستاروں اور سیاروں کے فرق کو خالی آنکھ سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ قایم ستاروں کی چمک مانند جھلملی ہوتی ہے اور متحرک سیاروں کی روشنی تیز اور زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ستارے بالذات روشن ہیں۔ اور آفتاب کی مانند اپنی روشنی سے دنیا کو روشن کرتے ہیں۔ بخلاف اسکے سیارے بالذات روشن نہیں ہیں۔ بلکہ ان پر آفتاب کی روشنی کا عکس پڑتا ہے۔ جیسا کہ آئینہ پر عکس پڑنے سے آئینہ چمکنے لگتا ہے۔ اسی طرح سیارے بھی چمکنے لگتے ہیں ؛

سیارے آفتاب کے گرد گردش کرنیوالے ستارے ہیں۔ اور زمین بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ جو شب و روز آفتاب کے گرد گھومتی رہتی ہے ؛

یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ کل نظام شمسی کا مدار اکیلی زمین ہی پر ہے۔ بلکہ اسکی مانند سات سیارے اور ہیں۔ اسطرح کل ملکر آٹھ سیارے ہو جاتے ہیں۔ جن کے نام مفصلہ ذیل ہیں۔ عطارد[۱] زہرہ[۲]۔ زمین[۳]۔ مریخ[۴]۔ مشتری[۵]۔ زحل[۶]۔ یورنس[۷]۔ نپچیون[۸]۔ مریخ و مشتری کے درمیان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے اجرام کا مجموعہ ہے۔ جو ٹوٹے ہوئے ستاروں کے ٹکڑے خیال کئے گئے ہیں۔

۱۸۵۱ء میں ان کی بابت خصوصیت کے ساتھ تحقیقات کی گئی تھی۔ بعض لوگ اس مجموعہ کو نواں ستارہ تصور کرتے ہیں۔ تصاویر ذیل نمبر ۲ و ۳ میں ان ستاروں کی باہمی جسامت کا مقابلہ کیا گیا ہے ؂

تصویر نمبر ۲ میں عطارد - زہرا - زمین اور مریخ کی اشکال ہیں ؂

اور تصویر نمبر ۳ میں مشتری - زحل - یورانس اور نیپچون دکھائے گئے ہیں ؂

اب یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ عطارد آفتاب سے قریب تر ہے۔ ان میں بیالیس کروڑ میل کا فاصلہ ہے۔ رفتار میں عطارد اور زمین میں چنداں فرق نہیں ہے۔ عطارد کا دن ہمارے دن سے صرف ۳ منٹ بڑا ہوتا ہے ؂

آفتاب سے قریب ہونے کیوجہ سے عطارد کی گردش صرف ۸۸ دن میں ختم ہوجاتی ہے اور یہی عطارد کا سال ہے۔ بخلاف ہمارے سال کے جو ۳۶۵ دن میں پورا ہوتا ہے ؂

ہماری دانست میں موسم اور شب و روز کے فرق کی یہ وجہ ہے کہ سیارے اپنے محور پر قدرے جھکے ہوئے ہیں۔ اگر یہ محور پر جھکے ہوئے نہ ہوتے تو آفتاب کی حرارت مساوی حصہ میں تقسیم ہوتی۔ اور سیاروں کی سردی و گرمی ہرگز بیقاعدہ واقع نہ ہوسکتی۔ یہ جھکاؤ سوائے دو تین کے باقی تمام ستاروں میں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عطارد زہرا اور زمین زیادہ جھکے ہوئے ہیں۔ انکی خمیدگی اسقدر ہے کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے گردن پکڑ کر جھکا دیا ہے۔ اور وہ اپنی باقاعدہ راہ سے کھسکا گئے ہیں ؂

اسوجہ سے شعاع آفتاب سے جو حرارت آتی ہے۔ وہ تمام حصص پر برابر تقسیم نہیں ہوسکتی۔ یہی رات دن کی کمی و بیشی اور موسموں کے اختلاف کا باعث ہے ؂

کرۂ ارض میں یہ خمیدگی ۲۳ درجہ کی ہے۔ اور عطارد میں ۰۰ درجہ کی پس ہم خیال کرتے ہیں کہ زیادہ خمیدگی کی وجہ سے عطارد کی گرمی و سردی میں اور بھی اختلاف ہوگا۔ اور اس کے ساکنین موسمی بیقاعدگی سے زیادہ تکلیف اٹھاتے ہونگے ؂

جسامت کے لحاظ سے عطارد زمین کا پانچواں حصہ ہے۔ اور زہرا کا نصف۔ یہ آفتاب سے پانچ کروڑ دس لاکھ میل کی دوری پر واقع ہے۔ اور ہماری زمین کی نسبت آفتاب سے تقریباً آدھی روشنی اور حرارت حاصل کرتا ہے ؂

اسکا دن ہمارے دن کے برابر ہوتا ہے۔ اور وہ ۲۲۴ یوم میں آفتاب کے گرد پھر کر اپنا

نقشہ (۲)
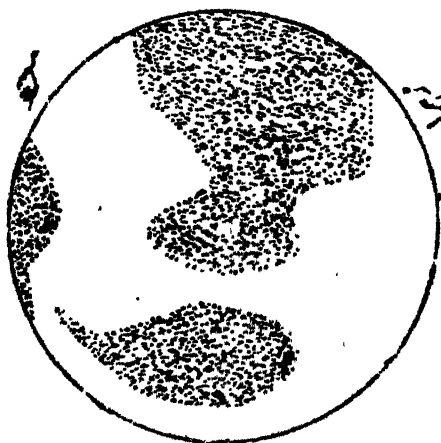
نقشہ نمبر (۳)

زمین

نیپچون

یورینس
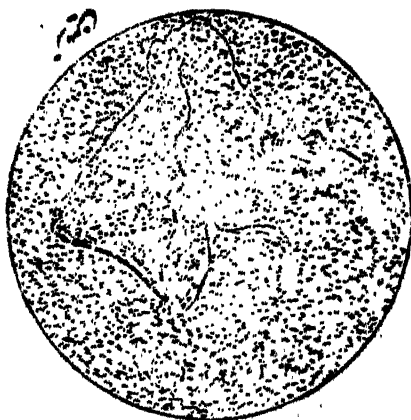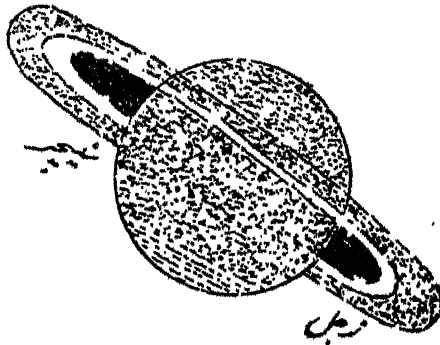
(جسامت سیاروں کی بمقابلہ زمین کے)
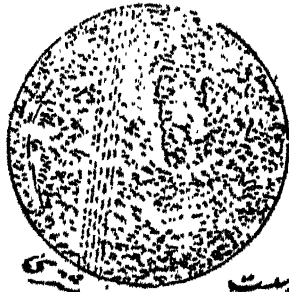
سال ختم کرلیتا ہے۔ وہ جسامت میں بھی زمین کے برابر ہے۔ زہرا کے چاروں طرف بادل ہی بادل نظر آتے ہیں۔ اسلئے خیال کیا جاتا ہے۔ کہ کثرت بارش کی وجہ سے وہاں بہت سے سمندر اور دریا ہونگے ؛

عطارد کی نسبت زہرا کے موسم چھوٹے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسکی خمیدگی ۷۵ درجہ کی ہے ؛

زہرا کے بعد ہماری زمین کا نمبر ہے جسکی دوری آفتاب سے پانچ کروڑ چالیس لاکھ میل ہے۔ اور اسکا قطر نوے ہزار میل ہے۔ اسکی یومیہ گردش ۲۳ گھنٹہ ۵۶ منٹ ۴ سکنڈ میں پوری ہوتی ہے۔ اور سالانہ گردش ۳۶۵ یوم ۶ گھنٹہ میں ؛

زمین کا محور ۲۳ درجہ خمیدہ ہے۔ زمین میں ایک خصوصیت ہے۔ جو عطارد۔ زہرا اور مریخ میں نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اسکو ایک قمر بھی ملا ہے۔ جو زمین سے ۲ لاکھ ستر ہزار میل کی دوری پر ہے۔ اور زمین کے گرد ہمیشہ گردش کرتا رہتا ہے۔ چاند کی گردش ۲۷ یوم میں تمام ہوتی ہے ؛

زمین کے بعد مریخ کا نمبر ہے۔ اور قدرت نے زمین و مریخ میں بہت کچھ مشابہت رکھی ہے بصورت وہیئت۔ آب و ہوا دن اور رات موسم وغیرہ کل چیزیں ان دونوں کی باہم ملتی جلتی ہیں صرف جسامت کا فرق ہے۔ کیونکہ زمین مریخ سے دوگنی ہے۔ اگر کوئی شخص زمین سے کرہ مریخ میں پہنچ جائے۔ تو اسے ایک ستارہ سے دوسرے ستارہ کے اندر جانا غالبًا محسوس بھی نہو۔ اور وہ سمجھے کہ وہ زمین ہی کے کسی دوسرے حصہ۔ مثلًا آسٹریلیا وغیرہ میں چلا آیا ہے ؛

اب ہم اس آسمانی سیر کے دوران میں ستاروں کے اس مجموعہ کیطرف آتے ہیں جسکی نسبت سطور بالا میں کچھ ذکر کر آئے ہیں۔ مگر ہم یہ ظاہر کرنے کے سوائے کہ انمیں سے ہر ایک آٹھ کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ اور وہ بھی آفتاب کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور کچھ نہیں کہہ سکتے ؛

نظام شمسی کے اندر سب سے بڑا سیارہ مشتری ہے جو جسامت میں زمین سے ایکہزار ایکسو گنا بڑا ہے وہ آفتاب سے بیس کروڑ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور اسقدر عظیم الجثہ ہونیکے باوجود بھی یہ انتہا تیز رو ہے حتّٰے کہ صرف ۱۲ گھنٹہ میں اپنے محور پر گھوم لیتا ہے۔ اسکا دن رات صرف ۱۰ گھنٹہ کے اندر اندر تمام ہوجاتا ہے۔ اسکے چاروں طرف چار قمر ہیں۔ جو رات اور دن روشنی دیتے رہتے ہیں۔ اور اسلئے وہاں پر رات اور دن کی روشنی میں تقریبًا کچھ فرق نہیں ہے ؛

اگرچہ اسکے شب و روز بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہیں مگر چونکہ اسکی خمی بہت کم بلکہ غیر محسوس ہے اسلئے اسمیں چار موسم ہیں۔ اور دن اور رات دونوں برابر ہیں۔ زحل کیطرح اسمیں ہمیشہ موسم بہار رہتا ہے۔

اور اس کی آب و ہوا میں شاذ و نادر اختلاف دیکھا جاتا ہے ؛
زحل کرہ ارض سے ۷۴۵ گنا بڑا ہے۔ اور آفتاب سے ایک سنکھ کروڑ بیس لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ وہ تیس سال میں آفتاب کے گرد گھومتا ہے۔ اسلئے ہمارے سال سے اسکا سال تیس گنا بڑا اور ہمارے دن سے اسکا دن بارہ گنا بڑا ہوتا ہے مشتری کیطرح زحل میں بھی دراصل چھوٹے ہی دن ہوتے ہیں لیکن چونکہ اسکے گرد آٹھ قمر بھی ہیں۔ اسلئے اسکی رات بھی نہایت روشن رہتی ہے۔ زحل میں خمی شکل ہوگی۔ اور اسکے ذرات میں کمی بیشی ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ اور اس میں بھی ہمیشہ مشتری کی طرح موسم بہار رہتا ہے ؛
زحل میں ایک خاص بات ہے جو اتنے ستاروں میں سے کسی میں نہیں ہے۔ وہ یہ کہ اسکے گرد ایک نورانی حلقہ پڑا ہوا ہے جسکی بالکل اسی کی سی ہیئت ہے۔ اور اسی کے مادے سے بنا ہے (دیکھو تصویر نمبر ۲) اس حلقہ کے بعد ایک دوسرا اور پھر تیسرا حلقہ ہے جنکا نام علم ہیئت کی اصطلاح میں مشتری کے حلقے رکھا گیا ہے ؛
یہ حلقے گول اور نہایت باریک (کل ۳۰ میل کے موٹے) ہیں۔ مگر انکی وسعت چوبیس ہزار میل ہے۔ اور زحل کے ساتھ ساتھ ہی گردش کرتے رہتے ہیں ؛
زحل کی عجیب و غریب ہیئت دیکھنے سے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ کہ خدا نے اپنی مخلوقات کو ضرور جدا جدا صورتوں پر پیدا کیا ہے۔ ہمارے خیال میں کل ستاروں کے باشندوں کو ایک ہی صورت کا خیال کرنا بڑی بھاری غلطی ہے ؛
یورنس کا حال تا ہنوز اچھی طرح معلوم نہیں ہو سکا صرف اتنا پتہ چلا ہے۔ کہ یہ زمین سے ۶۳ گنا بڑا اور آفتاب سے تہتر کروڑ بیس لاکھ میل کے فاصلہ پر ہے ؛
تصویر نمبر ۳ کے دیکھنے سے ہماری زمین اور یورنس کی ضخامت کی باہمی نسبت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ کرۂ ارض سے بہت دور واقع ہونے کے باعث ابتک یورنس کے مشاہدات بالکل ادھورے ہیں؛
نظام شمسی کے سب سے آخری سیارہ نیپچون کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یہ بہت چھوٹا اور بہت دوری پر ہے صرف آسمان کو دیکھکر اسکا حال معلوم کرنا محال ہے۔ یہ زمین سے صرف ایکسو پانچ گنا بڑا ہے۔ مگر آفتاب سے چار ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسکا سال زمین سے ۱۶۴ گنا بڑا ہے۔ اگر اسی حساب کے بموجب ہم زمین کی پیدائش کو صحیح خیال کریں۔ تو آجکل انیسویں صدی میں کل اسکا بارھواں ہی سال ہے۔ اگر اسکی بابت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ تو وہ صرف یہ کہ وہ ؛

ہماری محسوس دُنیا کا آخری سیارہ ہے ؛

یہ کہنا کہ اس مقام تک پہنچکر شمسی دُنیا کا خاتمہ ہی ہوجاتا ہے محض غلط ہے ہم اس معاملہ میں صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ اس سے آگے ہمارے آلات ہئیت کام نہیں دیتے ؛

نظام شمسی کو بغور دیکھا جائے ۔ تو معلوم ہوسکتا ہے ۔ کہ زمین حصول استحقاق میں منتقل نہیں ہے ۔ بلکہ وہ بھی دوسرے سیاروں کی مانند اپنا فرض ادا کرتی ہے ۔ اور اسیوجہ سے قدما کے خیال کے بموجب اسکو کسی قسم کی فوقیت نہیں دیجا سکتی ؛

غرض کل اُمور پر غور کرنے سے اتنی باتیں معلوم ہوتی ہیں ؛ زمین بھی دوسرے سیاروں ہی کی مانند ہے ۔ کل سیاروں میں ہوا ۔ پانی ۔ بر ۔ بحر ۔ پہاڑ ۔ وادی ۔ بیابان ۔ سبزہ زار ۔ حیوان ۔ انسان وغیرہ ہر طرح کی موجودات و مخلوقات ہیں ۔ جو ہمارے کرہ سے بہت ملتے جلتے ہیں ؛

مگر کیا یہ تمام باتیں صحیح ہیں ؟ کیا فی الواقع وہ ہماری ہی زمین کیطرح ہیں ؟ کیا در اصل انہیں سبزہ زار موجود ہیں ؟ اور کیا حیوانات و انسان ان میں درحقیقت بستے ہیں ؟ ؛

ان تمام دقیق سوالات کے جواب لائق فلاسفر فلیمیر نے اپنی ایک مصنفہ کتاب میں دئے ہیں اسکی تمام باتوں کو اس مقام پر درج کرنا تو فضول ہے ۔ مگر ہاں اتنا ظاہر کردینا ضروری ہے کہ فلاسفر موصوف نے زبردست دلائل سے یہ بات ثابت کردی ہے ۔ کہ ہماری زمین کیطرح زندگی ترتیب خیال ۔ احساس وغیرہ مناظر ان کروں میں موجود ہیں ۔ سترھویں صدی میں فانٹینل اور ہوجن صاحبان ۔ نے بھی نجوم اور علم طبیعات سے یہی نتیجہ نکالا تھا ؛

لہٰذا اگر کوئی صاحب اس معاملہ میں اپنی معلومات کو وسیع کرنا چاہیں تو صاحبان موصوف کی مصنفہ کتابیں ملاحظہ فرمائیں جنمیں اس علم کے کل معاملات بالوضاحت لکھے ہوئے ہیں ؛

فصل چہارم

فلیمیر صاحب کے قول کے مطابق کل سیاروں میں ذی حیات مخلوق یعنی انسان و حیوان موجود ہیں ۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اور کروں کے آدمی کرہ ارض کے انسان سے صورت و شکل میں متشابہ ہوتے ہیں ؟ ؛

ہم اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کرینگے ؛

ان انسانوں کو گو ہم دیکھ نہیں سکتے تاہم انکی باہمی مشابہت سے یہ اندازہ ضرور لگا سکتے

ہیں۔ اور قیاس غالب ہے کہ اور سیاروں میں بھی پیدائیش۔ ترکیب۔ ترتیب وغیرہ کے وہی اصول ہونگے۔ جو زمین پر ہیں ٭

یہ تو ہمکو بخوبی معلوم ہے کہ حیوانات و نباتات کس ترکیب سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہ سطح ارض جلتے ہوئے بخارات کا مجموعہ اور گیس تھی۔ اور ہمیشہ آفتاب کے گرد گردش کرتی رہتی تھی آہستہ آہستہ یہ گیس سرد ہونی شروع ہوئی۔ اور انجام کار رقیق شکل اختیار کرلی۔ اسکے بعد اس رقیق شے کا بھی ایک لوندا سا بنا۔ اور جب بالکل ہی سرد ہوگئی۔ تو ٹھوس بنگئی۔ یعنی سطح پر انجماد کیحالت شروع ہوگئی وجہ یہ کہ کرہ کی سطح باقی مادہ کی نسبت ہمیشہ زیادہ متاثر ہوا کرتی ہے۔ بس پانی اور بخارات جو ٹھوس پر بہتے تھے منجمد ہوگئے۔ اور جب مشتعل حرارت ٹھوس زمین پر گری تو پہلے سمندر بنے ٭

اس سوال کا کہ زمین کی ابتدائی حالت ایسی ہونیکا ثبوت کیا ہے ہم یہاں مختصر جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ تھوڑا سا رقیق مادہ لیکر اسکا گولہ بنالیجئے۔ اور اس گولے کو محور پر گھمائیے تھوڑی دیر بعد کیا ہوگا۔ کہ وہ بیچ میں سے پھول جائیگا۔ اور محور کے دونوں سرے پچکے ہوئے ہونگے۔ یہ نتیجہ گردش کی حرکت کا ہے۔ اسیطرح زمین بھی قطبین کے سروں پر پچکی اور خط استوا پر موٹی اور پھولی ہوئی ہوگی ٭

قیاس غالب ہے کہ زمین ہی کیطرح دوسرے سیاروں کا بھی آغاز ہوا ہوگا۔ اول وہ بھی گیس اور بخارات کا مجموعہ ہونگے۔ جو پہلے رقیق ہوکر لوندا سا بنے اور پھر ٹھوس ہوگئے۔ اسکے بعد ان کی سطحوں پر خارجی اثر پڑے۔ تو اور بخارات منجمد ہوکر سمندر بن گئے ٭

اگر کوئی صاحب اس لئے کو صحیح نہ مانیں تو وہ زحل اور مشتری کے سروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ کہ وہ زمین کی نسبت زیادہ چوڑے اور پچکے ہیں۔ اسلئے کہ وہ اپنے محور پر زیادہ تیزی کیساتھ گھوما کرتے ہیں ٭

ہماری زمین کے دن اور رات تو ۲۴ گھنٹے کے ہوتے ہیں۔ مگر زحل اور مشتری کے صرف دس دس ہی گھنٹے کے ہوتے ہیں محور کے سرے بھی زیادہ تیز رفتاری ہی کیوجہ سے چوڑے ہوجاتے ہیں ٭

زندہ موجودات اول اول سمندر کے پانی میں نمودار ہوئی تھی سب سے پہلے زوفائٹ کی شکل میں ذی روح حیوانات نے جلوہ دکھایا۔ چنانچہ باوجود لاکھوں سال گذر جانے کے مٹی کی تہ میں انکی لاشیں ابتک تبدیلی کی حالت میں پائی گئی ہیں ٭

جب زمین سرد ہوگئی۔ تو اسپر نباتات کا نمو شروع ہوا۔ چنانچہ ابتدائی سبزی ابتک زمین کی تہ میں ملتی ہے ٭

زود فائیٹ سے مچھلیاں وغیرہ پیدا ہوئیں! اسکے بعد حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں نے وجود لیا؛
اس زمانہ میں بہت بڑے بڑے کیڑے پیدا ہوتے تھے جنہیں دیکھکر آجکل ہمیں خوف معلوم
ہے۔ ان کیڑوں کی لاشیں بھی ابتک کہیں کہیں پائی جاتی ہیں؛

اسکے بعد ہوا کے صاف ہونے پر پرند پیدا ہوئے۔ اور وہ کرہ باد میں پرواز کرنے لگے قیاس
چاہتا ہے کہ حشرات الارض کیطرح یہ پرند بھی اس زمانہ کے پرندوں سے جدا گانہ شکل وصورت والے تھے؛

اسکے بعد شیر خوار جانور پیدا ہوئے جو آجکل انسانوں کیساتھ رہتے ہیں۔ اسکے بعد انھوں
نے مختلف شکلیں اختیار کیں اور ترقی کرتے رہے حتٰے کہ ترقی کرتے کرتے وہ انسانی قالب میں جلوہ نما ہوئے

تقریبًا کل سیاروں میں یہی کیفیت گذری ہے۔ اور ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے ہم کہہ سکیں
کہ دوسرے کرّوں میں اسطرح تخلیق عالم نہیں ہوئی۔ یا وہاں اسکے خلاف عملدرآمد ہوا ہے؛

یہ تو ممکن ہے کہ مشتری و زحل کی نباتات اور حیوانات ہماری سی نہوں۔ بلکہ انمیں شاید منشا بہت
تک نہو۔ مگر یہ کہنا کہ زندگی نے اسکے اندر ہمارے ہاں کی سی گوناگوں صورتوں میں ظہور نہیں کیا صحیح نہیں
ہوسکتا۔ دوسرے کرّوں میں بھی پرند اور حیوانات وغیرہ ہونگے۔ ہاں انھوں نے کسی قسم کی اعلےٰ اشکال
میں نشوونما پایا ہوگا۔ بایں ہمہ ان اعلےٰ شکل وصورت کے انسانوں کو بھی انسان ہی کہیں گے؛

ہمارے اس بیان سے یہ امر صاف واضح ہوتا ہے کہ کرہ ارض کی مانند ہر ایک کرہ میں انسان
آباد ہیں جو ہماری ہی طرح چھوٹے چھوٹے جانوروں سے ترقی کرکے انسانی درجہ تک پہنچے ہیں؛

یہانتک لکھ چکنے کے بعد ہم یہ دعوے کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں کہ تمام کرّوں کے انسان
خواہ وہ زمین کے رہنے والے ہوں یا مشتری۔ زہرہ اور زحل کے۔ سب کے سب ترقی کرکے فوق البشر
کے درجہ میں پہنچیں گے۔ اور وہاں سے بتدریج سوبرج میں پہنچ جائینگے؛

فصل یازدہم

انسانی حیات اور تسلسل پیدائش کی سچائی درجو گویا ایک مسلسل زنجیر کی بہت سی کڑیوں کو جوڑکر
اکٹھا کردیتی ہے۔ اور جسکے مطابق ایک چھوٹے سے جانور سے ترقی کرتے کرتے اعلےٰ انسانی صورت
تک اور انسانی صورت سے فوق البشر تک اور فوق البشر سے عظمت وجلال باری تعالےٰ کی زیارت حاصل
کرنے تک علم وقیاس حاصل ہوجاتا ہے) کی نسبت بہت سے ثبوت ہیں۔ اگر وہ سب بتفصیل بیان کئے
جائیں تو طول بے حاصل ہونیکا احتمال ہے۔ لہٰذا ہم چند خاص خاص ثبوت درج کرتے ہیں؛

ہم دُنیا میں کیوں ہیں؟ جبکہ ہمیں یہاں رہنے کی مطلق خواہش نہ تھی۔ اور نہ ہم پیدا ہی ہونا چاہتے تھے۔ اگر ہم سے رائے لیجاتی۔ تو ہم اعتراض کریں۔ اور اس دارالمحن میں آنے پر ہرگز رضامند نہوں۔ ہم زمین کی نسبت یقیناً کسی دوسرے مقام کی سکونت کو ترجیح دیتے کیونکہ ہمارا یہ کرہ ناپسند قیام گاہ ہے۔ کہیں بدرجہ غایت سردی ہے۔ تو کہیں انتہائی گرمی۔ اب اگر اخلاقی حالت ملاحظہ فرمایئے۔ تو وہ اور بھی ردی ہے۔ بدی تو گویا ہماری گھٹی میں پڑی ہے گناہ پر عزت افزائی ہوتی ہے۔ نیکی بُری سمجھی جاتی ہے۔ کسی کا باایمان ہونا اسکی بدنصیبی پر دال خیال کیا جاتا ہے۔ اگر ہم کسی سے محبت کرتے ہیں۔ تو اسکا انجام رنج و مصیبت ہوتا ہے۔ اگر اعزا واقربا کی محبت اور دوستی سے ہم کو کسی گھڑی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تو اسکے عوض میں انکی جدائی اور زندگی کے صدہا پُر الم واقعات سے ہزاروں گنا غمگین ہونا پڑتا ہے جو حواس ہمیں عطا کئے گئے ہیں۔ انتہا درجہ کے ناقص واقع ہوئے ہیں محض انہی کی وجہ سے ہمیں بہت کچھ تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ چند آدمی اگر صحیح و تندرست پائے جاتے ہیں۔ تو اُن سے کئی گنا زیادہ علیل اور مریض ملتے ہیں۔ جو بالعموم بیعقل، گونگے، بہرے، اندھے اور خبط الحواس ہوتے ہیں۔ یہاں ایک اگر حسین اور وجیہہ ہے تو دوسرا بدصورت۔ بدہیئت کمزور اور کوتاہ پشت ہے۔ درحالیکہ دونوں ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ دولتمند لوگ معدودے چند ہیں۔ اور مفلس و نادار بیشمار باوجود سخت جانگداز محنت کے بھی میں شاہزادہ نہیں بنا۔ خدا نے مجھے تو یوروپ اور فرانس میں پیدا کیا ہے۔ جہاں زندگی قدرے آرام سے گذرتی ہے۔ اور دوسروں کو ایسے مقامات میں پیدا کیا ہے۔ جو ہمیشہ مبتلائے مصائب رہتے ہیں۔ اور جہاں کی آب و ہوا تک ضرر رساں ہے۔ ان بیچاروں کو وحشیانہ طرز معاشرت سے کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ افریقہ کے سیاہ فام حبشی میری مانند خوش نصیب کیوں نہیں بنائے گئے۔ ہمنے ایسی کونسی خدمت انجام دی تھی۔ اور انہوں نے کیا گناہ کیا تھا۔ جو اس طرح تفریق مراتب رکھی گئی؟ کیوں بُرائی اسطرح غیر مساوی تقسیم کی گئی۔ کیوں بعض انسانوں کی حالت اس درجہ عبرتناک ہے؟ بعض ذہین اور بعض کند ذہن بلکہ فاتر الذہن کیوں ہیں۔ جو بیچارے شاہراہ زندگی پر قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں؟ ایسے بھی بہت سے انسان ہیں۔ جو زندگی کی ابتدا سے انتہا تک مبتلائے مصائب رہتے ہیں۔ آخر انکا گناہ قصور خطا؟ ایسے لوگ جو اپنی مرضی کے خلاف دنیا میں ہیں اور انجام کار زندگی کو ناقابل برداشت دیکھکر خودکشی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اس زمین پر پیدا ہی کیوں کئے گئے؟

اگر خدا تعالیٰ نے بلا وجہ لوگوں کو ان مختلف حالتوں میں پیدا کیا ہے۔ تو بیشک وہ نہایت بیرحم۔ سنگدل اور نا انصاف ہوگا۔

مگر دیکھو! میرے عزیزو! خداوند تعالیٰ میں انمیں سے ایک بھی بات نہیں۔ وہ ہرگز بے انصاف سنگدل اور بے رحم نہیں ہے۔ بلکہ اسکے برخلاف وہ مکمل وجود ہے۔ ان حالات میں انسانی ہستی اور پیدائش آدم کی غیر مساوی تقسیم کا سبب بالکل ناممکن البیان ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مذہب۔ اصول فلسفہ یا سائنس سے اس مسئلہ کو حل کرکے دکھائے۔ تو میں اسوقت اسکے سامنے اس کتاب کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ اور صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کروں۔

اور اگر یہ نہو تو پھر تم تسلسل پیدائش کو مانو۔ اور اس صورت میں دیکھو۔ کہ یہ مسئلہ کس آسانی سے حل ہوتا ہے۔ ہم روئے زمین پر تقدیر کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ہم عالم کائنات کے دور دراز اور طولانی سفر میں ایک سٹیشن سے گذر رہے ہیں۔ موجودہ پیدائش سے پہلے بھی ہم یا تو کسی اعلےٰ درجہ کے جاندار کی یا انسان ہی کی شکل میں تھے۔ موجودہ ہستی سابقہ ہستی کا نتیجہ ہے۔ یا تو ہمنے حیوانی روح کو پاک صاف کرنے کیلئے انسانی وجود قبول کیا ہے۔ یا ناقص اور خراب زندگی گذارنے کی سزا میں ہمیں اس عالم خرابات میں دوبارہ آنا پڑا ہے۔ تاکہ اب کے ہماری روح پاک صاف ہوکر فوق البشر کے قالب میں عروج کرے۔

زمین پر ہمارا قیام گویا طلسم امتحان ہے جسکی بدولت روح پاک صاف ہوکر اور نقصانات اور پاپوں سے آزادی حاصل کرکے آسمانی طبقات میں پرواز کریگی۔

ایک مدرسہ کے طالب علم کو دیکھو۔ اگر وہ اس سال خوب محنت کرتا ہے تو امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اسے دوسرے سال ترقی کا ایک درجہ حاصل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ محنت نہیں کرتا اور پاس نہیں ہوتا۔ تو مجبوراً دوسرے سال بھی اسے اسی درجہ میں پڑا رہنا پڑتا ہے۔ پس ہمارا خیال ہے کہ بڑے آدمیوں کی ناپاک ارواح پھر دوبارہ اسی دنیا میں پیدا ہوکر اور کمی اور فروگذاشت کو پورا کرکے فوق البشر میں ترقی کرتی ہیں۔

کسی دوسری طرح انسانی ہستی کا مسئلہ حل ہونا ناممکن ہے۔ صرف تسلسل پیدائش ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے وہ بآسانی حل ہو جاتا ہے۔ اور اس سے انصاف الٰہی پر بھی کوئی دھبہ نہیں آتا ہم جب زمینی زندگی کو صرف طلسم امتحان و دار الامتحان قرار دیتے ہیں۔ تو اسوقت معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ذات والا صفات دنیاوی باپ کیطرح رحیم ہے۔ خود ہی غور کرو۔ کہ کسی گنہگار کو بجائے اسکے کہ وہ ہمیشہ مبتلائے

معصیت رہے۔ یہ مناسب نہو گا۔ کہ اسے پھر ترقی اور عروج حاصل کرنے کا موقعہ دیا جائے؟ ہمارے خیال میں تو اسکو موقعہ دینا تاکہ وہ پھر نیک بن سکے اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ گناہ کے عوض میں بالکل پامال ہی کر دیا جائے۔ بس اس ترتیب سے خدا تعالی کی نیکی اور انصاف کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اور وہ سختی نہیں رہتی جسکی وجہ سے روح کو صرف ایک مرتبہ کے گناہ کے عوض میں ابدالآباد کا عذاب بھگتنا پڑتا ہے ؛

اگر انسان کی زندگی کو صرف امتحان ہی تصور کیا جائے۔ اور یہ مان لیا جائے۔ کہ یہاں ہم ابدی خوشی کیلئے سرمایہ بہم پہنچانے آئے ہیں۔ تو اس حالت میں اس سوال کی کہ ہم دنیا میں اور کس لئے پیدا کئے گئے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ مریخ یا زحل میں پیدا نہیں ہوئے۔ تشریح کرنے کی مطلق ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ اپنی آخری منزل پر خیال کرنے سے اس قسم کے سوالات محض فضول ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ فوق البشر بلکہ اس سے بھی افضل حالت کرنے کیلئے کر رہے ہیں۔ اور قدرت نے اپنے اس مقصد کیلئے ہمکو جہاں مناسب سمجھا چند روز کے لئے قایم کر دیا ؛

اگر اس اثناء میں ہم دیکھیں کہ کوئی اخلاقی بدی زندگی پر فتحیاب ہوئی یا کسی مجرم کو کسی ناکردہ گناہ میں سزا ملی تو ہمیں خدا کے برخلاف شکوہ و شکایت نہ کرنا چاہیئے۔ نہ دنیا کو [illegible] بھلا کہنا زیبا ہے ؛

تمام تکالیف، دکھ، بیماری، رنج و الم گویا اس امتحان کے سلسلہ میں برکات ہیں۔ ہمکو جسقدر تکالیف زیادہ ہونگی ہم اسیقدر جلد نجات پا کر ہم منزل مقصود کی راہ لینگے۔ بہت جلد انصاف ہو جائیگا۔ بد اپنے کیے کی سزا پا لینگے۔ اور نیک لوگ آسمانی طبقات میں چلے جائینگے۔ وہاں انکو نورانی خلعت اور طاقت ملیگی اور وہ اعلے درجہ کے حواس اور سچی آزادی سے مستفیض ہونگے ؛

ہمارے اس بیان کردہ اصول سے سلسلہ پیدائش کا دقیق و پیچیدہ مسئلہ بخوبی حل ہو جاتا ہے۔ اور انصاف الہی کی راہیں واضح طور سے نظر آنے لگتی ہیں۔ جن باتوں کی کوئی مذہب تشریح نہیں کر سکتا۔ نہ فلسفہ جن پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ وہ اصول مذکورہ بالا کی مدد سے دلخوش کن آسانی کیساتھ واضح ہو جاتی ہیں ؛

اب ہم ایک اور سوال کیجانب متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ یہ کہ عالم طفلی میں انتقال کرجانیوالے بچے کیا ہوتے ہیں؟ اکثر بچے تو پیدا ہونیکے بعد ایک دو ہی روز میں مر جاتے ہیں۔ اور بعض آٹھ نو سال کی عمر میں مرتے ہیں مسئلہ تناسخ اس پیچیدہ سوال کو بھی باسانی حل کر دیتا ہے۔ ان بچوں کی روح جو سال بھر سے کم عمر میں انتقال کر جاتے ہیں ابھی دنیا میں رہتی ہے۔ اور بالغ روح کی مانند فوق البشر میں شامل نہیں ہو سکتی۔ یہ اسی طرح ابتدائی حالت میں رہتی ہے۔ اور پھر نئے سرے سے دوسری زندگی شروع کرنے کو دوسرا قالب اختیار کرتی ہے ؛

اگر زندگی ایک سال سے زیادہ نصیب نہیں ہوتی تو وہ بار بار اسیطرح پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور تاوقتیکہ وہ ان اعلےٰ صفات سے جو فوق البشر کیلئے مخصوص ہیں متصف نہیں ہوتی۔ اسوقت تک اسکا سلسلہ تولید اسی طرح جاری رہتا ہے ؃

پس بچوں کی روح جنکے حواس و ادراک ناکمل ہیں اور جنکی روح پاک صاف نہیں ہوتی جنہوں نے جسمانی و اخلاقی مصائب کا تجربہ نہیں کیا انہیں مجبوراً زمین پر رہنا پڑیگا۔ بچے زیادہ تر مرتے ہیں اسلئے خیال کیا جاتا ہے۔ کہ قدرت نے اسمیں کچھ خاص مصلحت رکھی ہوگی ؃

خورد سال بچوں کیحالت کی تشریح بھی ایسی ہی ہے جیسی کہ قدرتی نظام آفرینش کی قدرت کا منشا یہ ہے کہ کوئی پیدا شدہ چیز ضایع نہ ہو۔ گنہگار کی روح گو ناپاک ہے۔ مگر چونکہ وہ روح زندہ اور دائمی ہے۔ لہٰذا اسکا ضایع ہونا مناسب نہیں۔ ہاں اسکی اصلاح ہو جانی چاہیئے ؃

پس یہ اصلاح سلسلہ پیدائش کے دوران میں ہو جائیگی۔ غیر مکمل روح دوبارہ اصلاح سے اصلاح یافتہ ہوکر نجات پاسکتی ہے اسی اصول کے رو سے بچہ کی روح دوسری زندگی میں پھر اپنے اس کٹھن سفر کو شروع کریگی۔ موت اسکی مزاحم نہیں ہوسکتی۔ روح اسیطرح محفوظ رہیگی۔ اور مطلق ضایع نہ ہونے پائیگی ؃

اس صداقت کو علم کیمیا نے ثابت کیا ہے۔ کہ دنیا کی کوئی شے فنا نہیں ہوسکتی۔ اجسام صرف صورتیں بدل دیتے ہیں ورنہ وہ لافانی اور ابدی ہیں۔ جب یہ بات سچی ہے۔ کہ مادی دنیا کی کوئی چیز فنا پذیر نہیں۔ تو بھلا پھر اس روحانی دنیا کی اشیا کس طرح فنا ہوسکیں گی؟ صرف ظاہری صورت میں تغیر واقع ہو جائیگا۔ یہ اخلاقی فلسفہ کا جدید اصول ہے۔ جو کیمیائی فلسفہ کیساتھ ساتھ کام کرتا ہے ؃

فصل شانزدہم

اگر کہا جائے کہ جسم ہی کیساتھ روح بھی پیدا ہوتی ہے۔ تو اسوقت ہم سوال کرینگے کہ پھر وہ ایک ہی قسم کیوں نہیں ہوتی جس حالت میں جسم سب ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ روح کا بھی ایک ہی قسم کا ہونا ضروری تھا۔ اور انکے قوائے ذہن وغیرہ میں اس درجہ اختلاف بالکل نہ ہونا چاہیئے تھا ؃

اسکے بعد ہم سوال کرینگے۔ کہ بعض کے میلان طبعی اسقدر مستحکم کیوں ہوتے ہیں۔ کہ انکو کسی غیر چیز کا سیکھنا پڑھنا تا بمقدور مشکل ہوجاتا ہے ؃

اور مشکل کیا وجہ کہ بعض بچے شکم مادر ہی سے نیک پیدا ہوتے ہیں اور بعض بد؟ بہت سے مغرور کوڑھ مغز اور اپنے اہل خاندان سے زیادہ بدکار و بدمعاش ہوتے ہیں ؃

بعض بچوں کو دیکھا گیا ہے۔ کہ انہیں جانوروں کو تکلیف پہنچانے میں لطف آتا ہے۔ بخلاف اسکے بعض بچے حیوانات کو درد و تکلیف میں دیکھکر رحم کھاتے اور متاثر ہوتے ہیں۔ اگر روح ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہے۔ تو صحبت و تعلیم کا اثر سب پر یکساں کیوں نہیں پڑتا؟ دو حقیقی مادرزاد بھائی ایک ہی استاد سے تعلیم پاتے ہیں۔ مگر انکی ذہانت میں بیّن فرق ہوتا ہے۔ انہیں سے ایک تو نیک سعادت مند اور [illegible] غایت پہنچا تا ہے۔ اور دوسرا اسکے بالکل برعکس۔ ہم پوچھتے ہیں۔ کہ جبکہ دونوں کی پیدائش میں [illegible] ہوا ہے۔ دو ایک ہی کھیت کے پودے دونوں ایک درخت کے ٹکڑے یا [illegible] ہی بیج نے نشوونما پایا ہے۔ تو اس اختلاف کو دیکھکر کیا اس سے انکار کیا سکتا ہے۔ کہ ان دونوں بھائیوں کی روحوں میں اختلاف ہے؎

اگر دونوں روحیں ایک ہی طرح کی ہوتیں۔ تو یہ حالت ہرگز نہ ہوتی جسم حیوانی قالب انسانی برگ نباتات سب ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ کہو ان میں کیا فرق ہوتا ہے؎

انسانوں کی ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک دوسرے سے بالکل ملتا جلتا ہوتا ہے۔ مگر اختلاف مزاج بے انتہا ہے۔ اچھا اور دیکھو کیا ہم روزمرہ کی معمولی باتوں میں یہ نہیں سنا کرتے؟ کہ فلاں لڑکے کو علم ریاضی کا بہت شوق ہے۔ فلاں علم موسیقی کا گرویدہ ہے۔ فلاں نقشہ کشی کو پسند کرتا ہے۔ بہت سے لڑکے خلقی مجرم و بد اخلاق ہوتے ہیں۔ لحد سے لیکر لحد تک بدمعاشیاں اور بدکاریاں کرتے رہتے ہیں؎

تاریخ قدیم بھی اختلاف طبائع کی بابت بہت کچھ شہادت دیتی ہے۔ پسکل نے صرف بارہ ہی سال کی عمر میں تحریر اقلیدس کے بڑے حصہ کی تحقیقات کی تھی۔ حالانکہ اسے نہ کسی نے سکھایا تھا نہ پڑھایا تھا کہ علم حساب تک بھی نہ جانتا تھا۔ صرف تحریر اقلیدس کی شکلیں اس کے مکان کے دروازہ پر کھینچی ہوئی تھیں۔ اور گمینا میلو نامی لڑکے نے ۵ سال کی عمر میں حساب لگانے کی کل ایجاد کی تھی۔ موزارٹ نے چار سال کی عمر میں باجا بجانا سیکھ لیا تھا۔ اور آٹھ سال کی عمر میں نظم میں ناٹک تصنیف کیا وغیرہ؎

ان مثالوں کو ہر شخص جانتا ہے۔ اور یہ واقعات کچھ مستثنیات سے نہیں ہیں۔ بلکہ اس قسم کی ہزار ہا باتیں ہماری روزانہ زندگی میں پیش آتی رہتی ہیں؎

کمسن بچے بعض باتوں میں بڑے بوڑھوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ بچے بچپن میں تو ہونہار معلوم ہوتے تھے۔ مگر جوانی میں آکر بگڑ گئے۔ اور ان کی امیدیں دل کی دل ہی میں [illegible] ملک حدیث کا قاری اور خوش گلو رہنے کی آواز جوانی میں آکر خراب ہو گئی۔

یا جو لڑکا چھوٹی سی عمر میں بہت اچھی تصویر کھینچ سکتا تھا۔ جوانی میں آکر ویسی نہیں کھینچتا؟

یہ اعتراض تو صحیح ہیں۔ مگر انکے جواب بھی نہایت آسان ہیں۔ جو بچے باوجود ذہین ہونے کے بڑے ہوکر خراب ہو جاتے ہیں۔ ان کی اصلی وجہ سستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ اس سے وہ کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں؛

اور بعض ناقابل و نالائق لوگ محنت و کوشش سے ان پر سبقت لیجاتے ہیں۔ یہ اصول قدرت ہے؛ اس قسم کے بچے ان خاص لیاقتوں اور قابلیتوں کیساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جو انمیں حیات سابقہ میں تھیں۔ مگر حیات ثانی میں چونکہ وہ ان لیاقتوں کو ترقی نہیں دیتے۔ اس لئے یہ علامتیں تکمیل حاصل نہیں کرسکتیں۔ مگر جن بچوں کے ذہن اعلےٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ اور جو اپنے جذبات فطرت کے موافق کام کرتے ہیں۔ ان کی قابلیتیں بڑھکر درجہ تکمیل حاصل کرلیتی ہیں؛

اگر یہ مانا جائے۔ کہ ہر ایک نئے جسم میں روح بھی نئی آتی ہے۔ تو اس حالت میں اس مسئلہ کا حل ہونا محال ہو جاتا ہے۔ مگر تناسخ چٹکی بجاتے ہیں۔ اسکو حل کر دیتا ہے۔ اکثر اوقات انسان میں پیدائشی طور سے اخلاقی اصول کی پابندی۔ تیز ذہنی اور اس قسم کی بہت سی قابلیتیں اور محنت وجفاکشی کی عادت ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں حیات سابقہ کا نتیجہ ہوتی ہیں؛

اس مقام پر سوال کیا جاسکتا ہے۔ کہ جب کسی کو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ تو اس مسئلہ کو کس طرح مانا جائے؟

اس سوال کا جواب حسب ذیل ہے کہ کسی واقعہ کا انسان کے تئیں بھول جانا آسان ہے۔ مگر اسکے نتائج خاص قوائے ذہنی کی طرح اسکی روح میں موجود رہتے ہیں؛

ہمنے بہت سے بوڑھے دیکھے ہیں جنہیں اپنے گذشتہ زمانے کی باتیں یاد نہیں ہیں۔ تاہم ان کے اثر ان کے ذہنوں میں موجود ہیں؛

اسیطرح گو بچوں کو حیات سابقہ کے واقعات یاد نہیں رہتے۔ تاہم ان کے اثر اور میلان دلوں پر باقی رہجاتے ہیں۔ اور وہ دوبارہ حیات تازہ حاصل کرتے ہیں۔ گویا ہوا کے جھونکے سے چراغ ایک مرتبہ بجھنے کے قریب ہوکر اور اپنا کل نور کھو کر پھر جل اٹھتا ہے۔ وہ سانس ہی تو حیات ثانی ہے جو قوائے ذہنی کے نیم خفتہ چراغ کو دوبارہ روشن کر دیتی ہے؛

گال صاحب کا علم قیافہ حیوانات کیحالت سے مشابہ کرکے دیکھو۔ تو معلوم ہو کہ کسقدر حیرت خیز تطبیق ہے؛

گال صاحب کی رائے ہے کہ قاتل کے سر میں ایک عجیب قسم کا ابھار ہوتا ہے اور اگر وہ ابھار سر

میں جابجا ہو۔ تو اس سے محبت۔ پیار۔ شہوت اور تمیز وغیرہ کا پتہ چلتا ہے بلا تردید علم قیافہ سے انسانی قوائے ذہنی کا اختلاف حالت نمایاں ہو جاتا ہے ؛

چونکہ علم قیافہ سے زیادہ تر دشواریاں پیدا ہونیکا احتمال تھا۔ اور سوسائٹی پر حرف آتا تھا۔ کیونکہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا میں بعض شائستہ آدمیوں کا کسی خاص وصف سے معرا ہونا سمجھا جاتا تھا اس لئے سوسائٹی نے اسکو خارج کر دیا ؛

مگر علم قیافہ کا خارج کرنا غیر مناسب تھا کیونکہ اس سے فطری ... میں ایک جدید نتیج حاصل ہوتی ہے۔ قیافہ صحیح ہے۔ اور اسکے صحت کی دلیل بھی تناسخ ہے۔ حیات سابقہ کے موافق روح۔ دماغ پر جو مبدائے قوائے متخیلہ ہے۔ اپنا اثر ڈالتی ہے اور اس طرح خاص خاص قسم کے نشیب و فراز سے اسکی قابلیتوں کا اظہار ہوتا ہے ؛

حکمائے سلف کا مقولہ ہے کہ روح جسم ساز ہے اس سے بھی ہمارے اصول کی صداقت ظاہر ہوتی ہے اگر کسی شخص کا دماغ ابھرا ہوا ہو۔ تو اس سے یہی حالت میں ثابت نہیں ہوسکتا۔ کہ ... روح ... ہی کیا ہے۔ وہ تو اسکے میلانات طبعی کے اظہار کا ذریعہ ... ہے ؛

بلکہ ممکن ہے کہ اگر قیافہ شناس اسے اول سے مطلع کر دے۔ تو وہ اپنے نفس پر جبر کرکے جذبات بد کو مغلوب کرلے کیونکہ غرور۔ شہوت۔ کینہ وغیرہ کے خیالات کو کمزور کر لینا بہت بڑی حد تک قبضہ قدرت میں ہے۔ جو لوگ ان اونے جذبات کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ وہ گنہگار ہیں۔ لہذا علم قیافہ سے سوسائٹی یا خدا کے نظام پر کوئی دھبہ نہیں آسکتا۔ مگر اسی حالت میں کہ ہم تناسخ کو صحیح مان لیں ؛

ڈسکارٹیز اور لینبز تحریر فرماتے ہیں کہ انسانی فہم میں ذاتی اور خلقی خیالات ... رہتے ہیں جنہیں ہم پیدائش کے وقت ہی ساتھ لاتے ہیں۔ یہ رائے بالکل صحیح ہے ... زمانہ ... کے مشہور فلاسفر ڈوگالڈ سٹوارٹ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ... اعتراف بھی کیا ہے۔ ہم اسکو تو مانتے ہیں۔ مگر ان فلسفیوں سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ وہ خیالات طبعی ہمارے دل میں آتے کہاں سے ہیں؟ اور دل کے اندر کیونکر جاگزیں ہو جاتے ہیں؟ ڈسکارٹیز کی فلاسفی اسکے جواب سے عاری ہے۔ وہ تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ ہم میں خیالات طبعی ہوتے ہیں ... کہ الٰہی مرضی ہی ہے جس نے روح کو پیدا کیا ہے۔ مگر یہ جواب غیر کافی ہے۔ کوئی ... حق میں پیش نہیں کی گئی ؛

برخلاف اسکے ہمارا اصول اس سوال کو بھی بوجہ احسن حل کر دیتا ہے۔ اور وہ یوں کہ اس قسم

کے ذاتی خیالات ہماری سابقہ زندگی کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں۔ سابقہ زندگی میں ہم نے جو کچھ سوچا۔ اور سمجھا تھا۔ ان سب کا اثر روح کیساتھ رہتا ہے۔ اور وہی خلقی سمجھو یا ذاتی ہمارے خیالات ہیں ؛

ہم لکھ چکے ہیں کہ کسی وجہ سے ہمکو سابقہ زندگی کی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ مگر یہ بھی نہیں کہ قوتِ حافظہ بالکل ہی کم ہو جاتی ہے ؛

ہر شخص کبھی نہ کبھی عالم تنہائی میں جبکہ وہ خیالات کے دریا میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ سابقہ زندگی کے عجیب و غریب منظر دیکھتا ہے ؛

روزانہ زندگی میں ہم کسی درخت پھول وغیرہ کو دیکھکر بیحد خوش ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تنہائی کے مقامات مثلاً جنگل۔ بیابان اور پہاڑوں سے ہم اس قدر متاثر ہوتے ہیں۔ کہ بے اختیار اشکِ حسرت جاری ہو جاتے ہیں۔ بہت سے آدمیوں کو کوئی خاص پھول یا درخت پسند ہوتا ہے۔ چنانچہ رسو کی بابت مشہور ہے کہ وہ ایک سدا بہار درخت کو دیکھکر ہمیشہ متاثر ہو جاتا تھا۔ الفرڈ ڈی ماسٹ بید کے درخت کو بہت چاہتا تھا۔ حتّٰے کہ مرتے وقت اس نے خواہش کی تھی۔ کہ اس کی قبر پر یہی درخت لگایا جائے ؛

کیا یہ تمام باتیں اس قدرتی اثر کو ظاہر نہیں کرتیں۔ جو ہماری سابقہ زندگی کیوجہ سے اب تک دھندلی یاد اور ٹمٹماتے چراغ کی طرح ہمارے دلوں پر موجود ہیں ؛

فصل ہفتدہم

اس مقام پر ہم ان تمام اصول کا خلاصہ درج کرنا چاہتے ہیں جنہیں صفحات بالا میں مشرح بیان کر چکے ہیں ؛

اوّل ۔ قدرتی ترتیب و ترکیب کا محرک اصلی آفتاب ہے ؛

دوم ۔ زندگی اور روح کا آغاز۔ پانی اور ہوا سے پودوں اور زوفائیٹ یعنی نباتاتی حیوانوں میں ہوا تھا۔ آفتاب کی کرنیں پانی اور زمین پر آکر نباتات اور زوفائیٹ پیدا کرتی ہیں۔ کرنیں جو گویا تخم روح ہیں۔ ساکنانِ طبقہ آفتاب سے خارج ہوتی۔ اور پودوں زوفائیٹ وغیرہ کو پیدا کرتی ہیں ؛

سوم ۔ نباتات اور زوفائیٹ میں قوت احساس موجود ہے جیوانات کی روح انہیں اسطرح رہتی ہے جس طرح درخت اپنے چھوٹے سے بیج میں حبابی شکل کے اندر رہتا ہے ؛

چہارم۔ یہ تخم نباتات اور زوفائیٹ سے نکلکر حیوان کی شکل میں منتقل ہوتا ہے۔ اور پھر ایک حیوان سے دوسرے حیوان میں جو پہلے سے برتر اور بالاتر ہوتا ہے۔ چلا جاتا ہے یعنی زوفائیٹ سے مونگا بنتا ہے۔ مونگے سے مچھلی اور مچھلی سے کیڑے بنتے ہیں۔ اور پھر کیڑوں سے پرند ہوکر پرندوں سے دودھ پینے والے حیوانات بن جاتے ہیں ؛

پنجم یہ روح قالب در قالب ہوتی اور نقل مکان کرتی ہوئی مکمل ہوجاتی ہے۔ اسمیں قوت مدرکہ و ممیزہ وارادہ پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور اسطرح سلسلہ بسلسلہ جب یہ شیرخوار حیوانات تک پہنچ جاتی ہے تو اسمیں اور ذہنی قوائے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اور اسکے بعد وہ ایک خوردسال بچے کی شکل میں نمودار ہوتی ہے ؛

ششم۔ چونکہ حیوانات قوت حافظہ سے محروم ہیں۔ اسلئے انکی طرح بچوں میں بھی یہ قوت نہیں ہوتی۔ اور کہیں ایک سال کی عمر میں جاکر ان میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت آتی ہے ؛

ہشتم۔ مرنے کے بعد انسانی جسم یہیں زمین پر رہجاتا ہے۔ اور روح ابھر کر ہوائے خالص کے طبقہ میں جاکر فوق البشر یا فرشتوں کے قالب میں پیدا ہوتی ہے ؛

نہم۔ روح اگر اس زمینی زندگی کے زمانہ میں آلودگی سے پاک صاف نہوجائیگی۔ تو وہ متواتر پیدا ہوگی اور اسے سابقہ زندگی کے گذشتہ واقعات یاد نہ رہینگے۔ مگر جب وہ مکمل اور پاک صاف ہوجائیگی تو عروج پاکر فوق البشر کے مرتبہ پر قابض ہوگی۔ اسوقت اسکو تمام گذشتہ واقعات یاد آجائینگے ؛

دہم۔ جو اموسیٰ سطح ارض پر ظاہر ہوتے ہیں۔ تقریباً وہی کل سیاروں میں نمودار ہوتے ہیں اور وہاں بھی شعاع آفتاب ہی کے ذریعے سے نباتات اور حیوانات پیدا ہوکر انسانی رتبہ پر قابض ہوتے ہیں ؛

یازدہم۔ سیاروں کے باشندے یعنی جو لوگ مریخ۔ عطارد۔ اور مشتری وغیرہ میں رہتے ہیں جب مرجاتے ہیں۔ تو اپنے جسموں کو وہیں چھوڑکر خود باشندگان کرہ ارض کی طرح طبقہ ہوائے خالص میں فوق البشر کا رتبہ حاصل کرتے ہیں ؛

دوازدہم۔ فوق البشر طبقہ ہوائے خالص میں پرواز کرتے رہتے ہیں۔ اور جو ارواح اس دنیا سے وہاں جاتی ہیں۔ ان سے ملتی ہیں۔ کل فوق البشر ایک ہی شکل و صورت کے ہوتے ہیں خواہ وہ کسی کرہ اور کسی سیارے کے باشندے کیوں نہ ہوں ؛

سیزدہم۔ فوق البشر خاص خاص صفات سے متصف اور خاص خاص قوٰی سے مزین ہوتے ہیں۔ بہ نسبت مادہ کے روحانیت انمیں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ خیال سے بھی زیادہ سریع السیر ہوتے ہیں۔ انکی بصارت بے انتہا تیز ہوتی ہے۔ جتنے کرہ وہ لیسے سترالٰہی تک سے بھی واقف ہوتے ہیں کہ جنہیں

عقل و نگاہ انسانی ہرگز سمجھ اور دیکھ نہیں سکتی ؛

چہاردہم - وہ فوق البشر جو کرۂ ارض سے ایتھر میں جاتے ہیں - دُنیا کے اُن لوگوں سے برابر ربط و ضبط رکھتے ہیں - جو اس ربط و ضبط کے قابل اور مستحق ہوں ؛

پانزدہم - فوق البشر کیلئے بھی مرگ و زیست لابدی ہے - وہ مرکر فوق الملاک کے درجہ پر پہنچتے ہیں - اور مادہ کی نسبت ان میں روح بہت ہی زیادہ ہوتی ہے ؛

شانزدہم - طبقات ہوائے خالص میں تناسخ بکثرت رہتا ہے - وہاں کے باشندے بار بار ترقی پاتے ہیں - اور رازہائے دنیاوی سے ہر لحظہ زیادہ آگاہ ہوتے جاتے ہیں ؛

ہفتدہم - جب فوق الملاک مکمل ہو چکتے ہیں - تو صرف روح مطلق رہجاتے ہیں جمیں مادہ بالکل نہیں ہوتا - اسی لئے انکے جسم نہیں ہوتے - اور وہ سیدھے سورج میں چلے جاتے ہیں ؛

ہیشردہم - آفتاب سیاروں کا بادشاہ اور ان تکمیل یافتہ روحوں کا آخری منزل گاہ ہے - جو تمام سیاروں سے گذر چکتی ہیں ؛

نوزدہم - پھر بھی روحیں آفتاب سے شعاعیں بنکر دوسرے سیاروں میں آتی ہیں انکے اندر مادہ حیات ہوتا ہے - جس سے کل دُنیا میں زندگی پھیلتی ہے - اور ہر قسم کے اُمور قدرت الٰہی کی بدولت انجام پذیر ہوتے ہیں ؛

بستم - ہمارے کرہ کے نباتات حیوانات آبی ہوں یا ہوائی - انہیں شعاعوں کی بدولت پیدا ہوتے ہیں - اور اسکے بعد تناسخ پیدائش یعنی تسلسل تولید (ایک جسم سے دوسرے جسم میں اور دوسرے جسم سے تیسرے جسم میں ارواح کا جانا) شروع ہو جاتا ہے - جو انجام کار اس آخری منزل یعنی آفتاب پر جاکر ختم ہو جاتا ہے - گویا یہ ایک قدرتی زنجیر ہے - جسکی ابتدا ہے نہ انتہا - اور جس میں تمام موجودات ایک خاندان کی طرح آپس میں گتھے ہوئے بیٹھے ہیں ؛

قدرت کوئی خط مستقیم نہیں ہے - بلکہ ایک دائرہ ہے جسکی نسبت آغاز و انجام کہا نہیں جاسکتا معلوم نہیں کہ وہ شروع کہاں سے ہوتا ہے - اور ختم کہاں ہوتا ہے - اہل مصر کی دوربین عقل نے دُنیا کو سانپ کی کنڈلی سے تشبیہہ دی تھی - جو چاروں طرف حلقہ مارے ہوئے ہے - یہ خاص صداقت ہے - جسے موجودہ زمانہ کے سائنس نے ڈھونڈ کر نکالا ہے - اور جو ایک عظیم الشان فتح ہے ؛

فصل ہشتم

اس اصول کے واقعات سے کیا عملی نتائج اخذ ہوتے ہیں

اب ہم ان چند عملی نتائج کو تسلیم کرنا چاہتے ہیں جو اس اصول سے پیدا ہوتے ہیں۔
انسان اگر پاک صاف ہوگا تو فوق البشر کے درجہ پر ترقی پاسکیگا لہٰذا ہر شخص کو اپنی
روح کو پاک صاف کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ اس اعلےٰ مرتبہ کو حاصل کرسکے۔ نیک
نیت مہربان۔ احسانمند۔ دوستوں کی حاجت برلانے والے اور مصیبت کے وقت میں انکے کام آنیوالے
بنو۔ مصیبت زدوں کی امداد اور غمگینوں کی دلجوئی کرو۔ سخاوت اور نیکی کو اپنا منہمک قرار
دو۔ اپنے خیالات کو صرف دنیا میں منہمک نہ کرو۔ عقبےٰ کا فکر لازمی ہے۔ ان مادی مرکبات سے
جو اخلاقی زندگی پر عیب لگاتی اور حرف رکھتی ہیں۔ احتراز کرو ہمیشہ نیک اور خوبصورت بننے کی کوشش
کرتے رہو اور اعلےٰ صحبت اختیار کرو۔ ان لوگوں کے ہمصحبت بنو۔ جو دنیاوی لذتوں سے نفرت کرتے
ہیں۔ یہی تمام وہ کمال دو باتیں ہیں جن سے تم اپنی روح کو درجہ کمال پر پہنچا سکتے ہو۔ اور فوق البشر بنکر
ارواح خالص کے طبقہ میں مسکن گزیں ہوسکتے ہو۔

بخلاف اسکے اگر تمہاری روح خراب ہوکر بہت گہرے دنیاوی تعلقات میں پھنس گئی
جسمانی لذات کے عوض میں تم اگر اپنا نفس بیچ چکے ہو۔ اور اگر تمہارا ضمیر اور عقل و دل وغیرہ
سب بیکار ہوگئے ہیں۔ تو جان لو کہ تمکو پھر بھی دنیاوی زندگی بھگتنی پڑیگی۔ جہاں عام طور سے
جسمانی تکلیفیں اخلاقی برائیاں دکھ۔ درد وغیرہ رنج وہ امور پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جہاں یہ تمام باتیں
گویا ایک عام قانون بن گئی ہیں۔

روحانی قواے کی ترقی سے ایک اور بھی فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ روح اگر نیک پاک ہوگی۔ تو
مرحوم عزیزوں کی ارواح سے گفتگو بھی کرسکیگی لیکن اگر روح میں اخلاقی برائیاں ہونگی۔ تو اسے پیاری
روحوں سے کسی قسم کی امداد ملنا تو کجا۔ وہ اس سے مخاطب تک ہونے کی روادار نہ ہونگی۔
سائنس کے ذریعہ سے بھی روح عروج حاصل کرسکتی ہے۔ قدرتی اشیا کو بغور دیکھو۔ اپنے چاروں
طرف کے مناظر کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جوں جوں تمہیں دنیا کا علم ہوتا جائیگا۔ اسیقدر تمہاری
روح بھی ترقی کرتی جائیگی سرزمین پر ایک ارب تیس کروڑ انسان آباد ہیں جنمیں سے صرف شاید
ایک کروڑ سائنس سے واقف ہیں۔ باقی ایک ارب انتیس کروڑ آدمی بالکل جہولیت کی حالت میں زندگی

کے ایک قطرہ میں مسکن گزیں ہیں۔ یہ چھوٹی سی مخلوق بھی اسیطرح رہتی ہے جسطرح بڑی اور بڑوں ہی کی طرح کام کو بھی انجام دیتی ہے ؛

جسطرح ہمنے اس چھوٹی مخلوقات کی حقیقت کو معلوم کیا ہے۔ اسیطرح وسعت افلاک کی گہرائی کا پتہ لگایا ہے۔ ہمنے خود اپنی آنکھوں سے انگنت میلوں پر سیارونکو گردش کرتے دیکھا ہے۔ دوربین نے ہمارے سامنے چاند کی سطح۔ اسکی وادیاں اور پہاڑ وغیرہ صاف طور سے رکھدیئے ہیں۔ ہم ماہتاب کو کسی زمینی منظر کیطرح نہایت آسانی کیساتھ اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور دوربین کے ذریعہ سے ہمنے کئی ایسے ستارے بھی دیکھے ہیں جو بعید مسافت کی وجہ سے برہنہ آنکھ سے ہرگز نظر نہ آسکتے تھے ؛

جبکہ سائنس اسطرح ترقی کے اعلےٰ معراج پر پہنچگیا ہے۔ تو ہوسکتا ہے کہ ہر شخص اس سے واقفیت حاصل کرنیکا خواہشمند ہو۔ مگر مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ ابھی تک ہزاروں لاکھوں آدمی اسکے ابتدائی اصول تک سے بھی ناواقف ہیں۔ اگر ان ایک کروڑ کو جنکی بابت پیشتر ذکر کیا جاچکا ہے۔ ستثنےٰ کر دیا جائے تو پھر سائنس دانی کیلئے ایک لفظ لا ہے۔ جو ادھر سے اُدھر تک نظر آئیگا۔ بہت سے حضرات تاہنوز اس پھیر میں پڑے ہوئے ہیں کہ زمین چپٹی ہے۔ اور اسکے اوپر بطور گنبد کے یہ آسمان بنا ہوا ہے اگر انکے سامنے گردش ارضی کا ذکر کیا جائے۔ تو وہ مذاق اڑاتے اور قہقہہ لگاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ زمین کونسی حرکت کر رہی ہے وہ تو سورج ہے۔ جو مشرق سے مغرب کو دورہ کرتا ہے ؛

انکا یہ خیال ہے کہ یہ چمکدار ستارے ہمارے لیئے ایک نظر فریب سیرگاہ بنائی گئی ہے اور ماہتاب ایک مشعل ہے۔ جو اپنی روشنی سے رات کو روشن رکھتا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں کوئی نہ بارش کا حال جانتا ہے نہ گرمی، سردی، ہوا اور مدوجزر کا۔ اگر مناظرِ قدرت پر ان کی نظر بھی پڑتی ہے تو وہ آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ تاکہ ان کی تصریح و تشریح کی تکلیف اُٹھانی نہ پڑے۔ گویا قدرت نبی نوع انسان کے عظیم الشان گروہ کے لئے راز سربستہ ہے۔ جنکا کام یا تو کھانا پینا ہے یا ابنائے جنس کو تکلیف پہنچانا ؛

افسوس یہ منظر کسقدر رنجدہ ہے۔ انسان صرف مادی ضروریات کے رفع کرنے میں منہمک رہتا ہے۔ اور دماغی ترقی کے خیال کو اسنے بالکل بالائے طاق رکھدیا ہے ؛

مبارک ہے وہ شخص جسنے اپنے خیالات درست کئے ہیں۔ اور سائنس کی کسی شاخ کا مطالعہ شروع کر دیا ہے اور اسطرح اپنے دماغی قوائے کی ترقی میں کوشاں ہے۔ ناظرین! آپ کو بھی مطالعہ قدرت و تحقیقاتِ فطرت کا شوق ہونا چاہیئے معرفت [illegible] معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ جو کچھ تمہارے

گرد ہے ۔اسے دیکھو ۔قدرتی مصنوعات کو دیکھکر اسکے صناع کی حمد و ثنا بجالاؤ ۔ اسطرح تمہاری روح موت کے وقت ایسے جاہل نہ رہیگی جیسی کہ پیدائش کے وقت تھی ؛

پس موت کے بعد تم صاحب فہم و ذکا ہوگے ۔ اور فوق البشر مخلوق میں شامل ہوکر طبقہ ہوائے خالص میں سکونت اختیار کروگے ؛

ہاں یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے ۔کہ تکمیل روح کے لئے صرف درستی اخلاق ہی کافی ہے یا کم و بیش علم کا پڑھنا راہ نجات تک پہنچا سکتا ہے ۔ہمکو معرفت الٰہی بھی ضروری ہے ہر شخص پر مذہبی قانون کے مطابق عبادت خانوں میں جاکر سجدہ الٰہی بجالانا اور نیاز کے ساتھ شکریہ الٰہی ادا کرنا ضروری ہے ۔کسی مذہب کو بُرا کہنا اور اسکی ہتک کرنا بُرائی ہے ؛

بلکہ حتے المقدور ہر مذہب کی تعظیم کرنا چاہیئے ۔ اسلئے کہ سب مذہب خداوند کریم کی تعظیم کرنا سکھاتے ہیں ؛

مسیحی مذہب اسلئے اچھا ہے ۔کہ وہ اپنا مذہب ہے ۔ مسلمانوں کا مذہب اسلام یوں اچھا ہے کہ وہ فی الواقع اچھا ہے ۔ اسی طرح بُدھ مذہب بھی اچھا ہے ۔اور ہندوستانیوں کا مذہب بھی جو جنگل کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے سورج کی پرستش کرتے ہیں ۔ اچھا ہے ؛

چوتھا قاعدہ یہ ہے کہ ہمکو اپنے مرحوم عزیزوں کی یاد رکھنی چاہیئے ۔اور انکو کبھی بھولکر بھی نہ بھولنا چاہیئے ۔کیونکہ ہماری فراموش کاری سے ایک تو انکو تکلیف ہوتی ہے ۔دوسرے ہم بھی انکے نیک صلاح اور اچھے مشورہ سے محروم رہ جاتے ہیں ؛

زمانہ قدیم کے لوگ اپنے مرحوم عزیزوں کی یادگاریں قائم رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔ وہ آجکل کے لوگوں کی طرح موت سے نہ ڈرتے تھے یونانی ۔رومی اور مشرقی اقوام جُدا جُدا طریق سے انکو یاد رکھا کرتی تھیں ؛

یوروپ میں لوگ اس دانائی سے بے بہرہ ہیں ۔ ہاں دہقانی کسان جو بہ نسبت شہر والوں کے قدرت سے زیادہ نزدیکی اور مناسبت رکھتے ہیں ۔کبھی اپنے مرحوم عزیزوں کو فراموش نہیں کرتے اور ان سے گفتگو کرکے اکثر نیک صلاح و مشورہ لیتے رہتے ہیں ؛

قدیم اقوام میں مُردوں کی تعظیم میں دعوت دینے کا طریقہ چلا آتا ہے ۔ یہ طریقہ قدیم ہے ۔مگر ہمارے ممالک میں قبر پر صرف دو پھول چڑھا دینا ہی کافی سمجھتے ہیں ۔حالانکہ مردوں کی تعظیم کا سبق قدرت ہمکو خود سکھلاتی ہے ؛

آخر میں ناظرین کتاب ہذا سے یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ہمکو موت سے خوف نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ نہایت اطمینان اور دلجمعی کیساتھ اسوقت کا منتظر رہنا چاہیئے۔ کیونکہ موت خاتمہ حیات کو نہیں کہتے وہ محض ایک تبدیلی ہے ہم فنا نہیں ہوجاتے۔ بلکہ صرف تبدیل ہوتے ہیں۔ وہ کیڑا جو پیاسنگ تہ کے اندر رہتا ہے۔ گو بادی النظر میں مرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر فی الواقع وہ مرتا نہیں۔ بلکہ تتلی کے خوشنما رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ پس یہی حال ہمارا بھی ہوگا۔ خاکی جسم تو عناصر میں مل جائیگا اور روح فوق البشر کی صورت اختیار کریگی۔ اسوقت ہم اس مصیبت بھری دنیا کو چھوڑ کر بہت ہی بہتر مکان میں ہونگے۔ جہاں ہر قسم کے عیش و آرام ہیں ؂

لہٰذا موت سے خوف کرنا سراسر غلطی ہے۔ بلکہ ہمکو نہایت اطمینان کیساتھ اسکا انتظار کرنا چاہیئے موت ہی ہماری اور ان لوگوں کی ملاقات کا باعث ہوگی۔ جو ہمسے پہلے بہشت بریں یا عالم بالا کے طبقہ میں جا پہنچے ہیں۔ اور جو ہمیں اس دنیا میں نہایت عزیز رہ چکے ہیں۔ اسوقت ہماری بقیہ زندگی میں کسقدر اطمینان اور تسلی ہوگی۔ اور حالت نزع میں وہ عزیز دوست جو ہمیں کبھی بھی فراموش نہیں کرتیں۔ آکر تسلی دینگی۔ اور اسطرح وہ تکلیف جو چند آخری لمحوں میں ہوا کرتی ہے کم ہوجائیگی۔ جو لوگ موت سے بہت ڈرتے ہیں۔ آخری وقت میں انکا خوف بھی کم ہوجائیگا۔ جن لوگوں کو کبھی موت کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں۔ کہ نزع کی تکلیف کیسی کچھ ہوتی ہے۔ مگر جو لوگ اس زندگی میں اچھے کام کرتے ہیں۔ انکو امید ہوتی ہے۔ کہ ہم اس سے بہتر دنیا میں جانے والے ہیں ؂

یہ مشاہدات ان لوگوں کے ہیں۔ جو موت کے مناظر دیکھنے کے عادی ہیں۔ گو وہ لوگ جنکے حواس بیماری کیوجہ سے سلب ہوگئے۔ اور قوت گفتار وغیرہ زائل ہوگئی۔ اس سے مستثنےٰ ہیں۔ اس مقام پر ہم صرف انہی لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جنہوں نے آخر تک اپنے قوائے ذہنی کو قائم رکھا ہے۔ اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ مرے ہیں۔ مثلاً تپ دق اور فساد معدہ وغیرہ کے مریض نہایت اطمینان کے ساتھ مرتے ہیں۔ کیونکہ انکی دماغی قوتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ صرف جسمانی قوتیں زائل ہوتی ہیں۔ ان تمام بیماریوں میں آہستہ آہستہ طاقت گھٹنی شروع ہوتی ہے۔ حتّےٰ کہ مریض خود بھی ان تبدیلیوں کو محسوس نہیں کرسکتا۔ اور وہ نہایت بے پرواہی کیساتھ موت کا منتظر رہتا ہے ؂

اکثر ایسے وقت بھی آتے ہیں۔ اور وہ کئی کئی گھنٹہ تک قائم رہتے ہیں کہ انسان کی روح جسم سے نکل جاتی ہے۔ دیکھنے والے سمجھتے ہیں۔ کہ یہ لاش پڑی ہے۔ مگر وہ لاش ہی خود بولتی اور باتیں کرتی ہے

واضح ہو کہ وہ روح جو اس مردہ کے جسم میں گفتگو کرتی ہے۔ انسان کی نہیں۔ بلکہ فوق البشر کی ہوتی ہے۔ مرنے والے کو بخوبی ہوش ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ رنج و مسرت کا بھی اظہار کرتا ہے۔ یہ حالت کچھ تو اس دنیا کی ہوتی ہے۔ اور کچھ اُس دنیا کی۔ بالکل جاہل اور اَن پڑھ لوگ بھی ایسی فصاحت و بلاغت سے گفتگو کرتے ہیں۔ کہ سننے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ اِن واقعات کی جو آئیندہ زمانہ میں پیش آئینگے۔ اطلاع دیتے ہیں۔ ایک گاؤں میں ایک کسان مرکر پھر جی اُٹھا۔ لوگوں نے اس سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ کہ ہمارے رشتہ داروں کی کیا کیا خبر لایا۔ اس نے اپنی سمجھ کے موافق جیسا کچھ سمجھا ان کو بتا دیا ؎

ایک مرتبہ کاؤنٹ ٹنٹ صاحب نے جبکہ وہ قریب المرگ تھے۔ ایک خواب دیکھا تھا۔ جو ہدیہ نظر ناظرین کیا جاتا ہے۔ میں سخت بیمار پڑ گیا۔ حتّٰے کہ زندگی کی بھی اُمید نہ رہی میری روح مادی جسم سے نکل سکے اور پھیلگئی میرے تئیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ روح میرے تمام جسم سے نکلکر صرف دل میں اکٹھی ہوگئی ہے۔ اسوقت میرے دلپر ہزاروں خیالات کا جو تقریبًا سب کے سب آئیندہ زندگی کے متعلق تھے ہجوم تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ تمام دکھائی جاتے رہے۔ اور صرف یاد الٰہی و محبّتِ خداوندی باقی رہ گئی۔ میری روح کو جسمانی تکالیف کا صدمہ گذرا۔ اور عزیزوں کی یاد نے بہت کچھ ستایا۔ یکایک میری زندگی کے خاتمہ کا وقت آگیا۔ یکدم اندھیرا چھا گیا۔ رفتہ رفتہ پھر روشنی ہوئی۔ اسوقت مینے نورِ الٰہی کو دیکھا جسکی میرے دلمیں بے انتہا خواہش تھی۔ اس مقام پر میں نے اسکو اس دنیا سے کہیں زیادہ پیار کیا۔ یہانسے مجھے وہاں زیادہ معرفتِ الٰہی حاصل ہوئی۔ اسوقت مینے قدرت کی عجیب و غریب صناعی کو بنظرِ غور دیکھا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ زمین میں اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ وہ اپنے سربستہ رازوں کو مجھسے چھپائے رکھ سکتی۔ زمین کی کل چیزوں کو میں نے بغور دیکھا۔ میں نے ان ذرائع کو بھی دیکھ لیا جلسے سمندر میں پانی پہنچتا ہے۔ اسوقت مجھے زمین کی حرکت اور ستاروں کا تعلق معلوم ہوا۔ میں نے وہاں دور دراز ملک کے باشندے دیکھے۔ جنکے رسم و رواج وغیرہ سب کے سب مختلف تھے۔ اسوقت ندائے غیب نے مجھسے کہا۔ تیری طرح یہ کل انسان خدا تعالےٰ کی صورت پر بنے ہیں۔ اور تیری ہی طرح یہ بھی اسکی جانب جا رہے ہیں۔ اور اپنے سفر سے بھی آگاہ ہیں ؎

یہ بات دیکھی گئی ہے کہ جو لوگ قبل از وقت مرجاتے ہیں۔ اُنکے دل کو زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے ہمارے نزدیک تو انکی اخلاقی حالت ایسی ہوتی ہے کہ انہیں اس حالت کا جو موت کے بعد پیش آتی ہے۔ گویا علم حاصل ہو گیا ہے۔ جو لوگ تپدق سے مرتے ہیں۔ وہ اسوجہ سے حلیم ہو جاتے ہیں کہ نصف

تعلق اس دنیا سے رہتا ہے۔ اور نصف فوق البشر مخلوق سے ان میں پہلے ہی ان کی صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور انکو جو کچھ خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اپنی آئندہ کی بہتری معلوم ہوجانے کیوجہ سے ہوتی ہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ تپ دق والے لوگوں کو اپنے مرض کی اصلی کیفیت کا علم نہیں ہوتا اور وہ اسکی اصلیت کو نہیں جانتے۔ لہٰذا وہ خوش رہتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تعالٰے نے انکے دلوں میں آنیوالی خوشی کا اثر پیدا کر دیا ہے۔ دلی اطمینان ان کو آئندہ زندگی کی امید میں خوشی وشادمانی بخشتا ہے۔ وہ آئندہ زندگی یہاں کی نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسرے عالم کی ہوتی ہے ؛

مگر یہ کیفیت صرف تپ دق ہی سے مرنیوالے مریضوں کی نہیں ہوتی۔ بلکہ تقریباً ہر ایک نوجوان مرنیوالے کے چہرے سے آخری لمحوں میں خوشی وشادمانی کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔ بہت سے نوجوانوں کے اچھے اخلاق و عادات کا اسی سے اندازہ لگتا ہے۔ اور صاحب فہم اصحاب معلوم کر لیتے ہیں۔ کہ اب یہ شخص اس دنیا میں نہ رہیگا ؛

یونانیوں میں ضرب المثل ہے کہ خدا تعالٰے جنہیں پیار کرتا ہے۔ انہیں اپنی طرف اٹھا لیتا ہے پس موت سے ڈرنا عبث ہے۔ بلکہ ہمیں تو ہر وقت اسکا منتظر رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ صرف اسکی حالت بدلتی ہے۔ اپنے زمانہ حیات کی پاکیزگی اور اپنے علم اور پابندی احکام سے ہمیں اس تبدیل حالت کیلئے ہر دم مستعد رہنا چاہیئے۔ تاکہ مرنے کے بعد ہم ہوائے خالص کے طبقات میں سیر کرنے کے قابل ہوجائیں ؛

مرنے کے بعد جیو کی کیا حالت ہوتی ہے

(ہندو نکتہ خیال سے)

اگر کوئی کہے۔ کہ مرنے کے بعد جیو کی کیا حالت ہوتی ہے۔ تو یہی کہا جائیگا۔ کہ جو حالت موت سے پہلے ہے۔ وہی اسکے بعد ہوگی۔ موت سے پہلے اگر مکت حالت میں ہے۔ تو جیون مکت ہونے کے باعث مکتی میں جائیگا۔ اور اگر بندھن میں ہے۔ تو بندھ وشا میں قید ہوجائے گا ؛

روح کی جسم سے علیحدگی کے بعد دو حالتیں ہوجاتی ہیں۔ (۱) مکت یعنی آزاد حالت۔ (۲) بندھن یعنی حالت قید ؛

زندگی اور موت کیا ہے

جن لوگوں نے اپنے عزیزوں۔ دیہاتی بندوں کو مرتے دیکھا ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ

وقت مرگ مرنیوالے کی جسمانی حالت کیا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی سب لوگ جانتے ہیں۔ کہ اس جسم کے چلانیوالی طاقت کوئی اور شے ہے۔ جو جسم سے علیحدہ ہے۔ جو اس سے نکل جانے پر اسے مردہ بنا دیتی ہے۔ پس اسی کا نام جیو آتما یعنی روح ہے۔ اسکا جنم مرن کوئی چیز نہیں۔ صرف جسم کے ساتھ اسکا سنجوگ یعنی ملاپ جنم ہے۔ اور علیحدہ ہونا موت ہے۔ شری کرشن بھگوان نے کہا ہے۔ کہ جیو نہ کبھی پیدا ہوتا نہ مرتا ہے۔ یہ قدیم قایم بالذات ہستی ہے۔ نہ اسکی پیدائش ہے نہ فنا ؛

جو لوگ اس حقیقت روح سے ناآشنا ہیں۔ انکا تمام پڑھنا۔ لکھنا بیفایدہ ہے۔ اور یہ روح کی اصلی ہستی ہے۔ اسکے خلاف سمجھنا غلطی ہے۔ کسی نے کہا ہے۔ ؎

اور علموں سے تجھے کیا فایدہ
علم اپنا گر نہیں ناداں تجھے

جو انسان جیو آتما کی ہستی سے بھی ناواقف ہے۔ وہی مورکھ ایک جنم چھوڑ کر دوسرا جنم دھارن کرتا ہے ؛

مکت وشاوہ ہوتی ہے جبوقت جیو آتما اپنے آپ کو اودیا سے رہت ہو کر جیون مکت بنا لیتا ہے ؛

مرنے کے بعد جیو کہاں جاتا ہے،

الغرض ایک حالت تو یہ ہے کہ جسم کو چھوڑ کر دوسرا جنم نہ لینا اور پرماتما کے آسرے پر اپنا جیون تمام کرنا۔ اور دوسری حالت بندھن یعنی قید کی ہے۔ انسان کی خواہش اسکے افعال سے ظاہر ہوتی ہے۔ کرشن چندر جی فرماتے ہیں۔ کہ جیسے انسان اس شریر میں خواہش سے چلتا پھرتا ہے۔ اسیطرح جیو آتما بھی اپنی خواہش کے مطابق ہی جدھر چاہتا ہے ہو لیتا ہے ؛

مرنیکے بعد علم۔ ابھیاس اور کرم یہ تین جیو کیساتھ جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ جب انسان مرتا ہے۔ تو اسکے بعد چتر گپت کے پاس جاتا ہے۔ یہ درست ہے۔ چتر نام ہے تصویر کا اور گپت دیکھنے والے کو کہتے ہیں۔ جو آدمی مرتا ہے۔ جیو کے سامنے اسکے نیک و بد افعال کا فوٹو آجاتا ہے۔ اسوقت کف افسوس ملتا ہے۔ لیکن دیرینہ اثرات اور جذبات لوح آتما پر مضبوطی سے منقش ہوتے ہیں۔ اسلئے اُسے اپنے ہی افعال کی خواہش ہوتی ہے جنکا کہ وہ [illegible] رہا ہو۔ پس اسیطرف اسی صورت میں جاکر جنم لیتا ہے۔ جہاں وہ ان جذبات کی سیری آسانی سے کر سکے ؛

حصول مکتی کا سادھن

انسان کا جسم دو طرح کا ہے۔ ایک جسم کثیف۔ دوسرا جسم لطیف جسم کثیف سے مراد پنج

عناصر سے مرکب شریر سے ہے۔ اور جسم لطیف پانچ کرم اندری یعنی حواس اعمالی و پانچ گیان اندری یں حواس علمی اور گیارھواں من جیسے بعض قیدیوں کی حالت ہوتی ہے۔ کہ ایک تو وہ زندان خانہ میں ہوتے ہیں۔ اور اسپر بھی بیڑیاں پڑی ہوتی ہوتی ہیں۔ اسطرح انسان کیحالت ہے۔ ایک تو انسان کا یہ جسم جیلخانہ ہے۔ اور اسپر سوکھشم شریر یعنی جسم لطیف بیڑی ہے۔ من اسس کو چلانے والا ہے ؛

اب ذرا اصول علت و معلول پر غور کریں۔ ہر ایک فعل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور ہر ایک نتیجہ کا فعل معلول بغیر علت ہو نہیں ہوسکتا۔ پس جیو جب بندھن میں آتا ہے۔ تو لازمی ہے۔ اسکا کوئی سبب ہو۔ اور سبب سوائے گذشتہ جنم کے۔ افعال کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر اگر گذشتہ جنم نہ مانو۔ تو بغیر افعال کے نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ پس یہ سکھ دکھ کیوں ؟ ؛

اب رہا یہ امر کہ کونسے افعال انسان کو جال میں پھنساتے ہیں۔ اور کون چھڑاتے ہیں۔ موت کا خوف راگ دویش۔ کوشش۔ خواہش یہ پانچ تکالیف ہیں۔ جنمیں جیو پھنسا ہوا ہے۔ جیسے اپنی حالت کو آتما سمجھا۔ وہ جسم کو چھوڑ کر دوسرا حاصل ہوتا ہے۔ اور مکت ہوا جیو آتما موکش حاصل کر لیتا ہے ؛

جنہوں نے اپنے آپکو جسم ہی سمجھا ہے۔ وہ موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو جسم کو علیحدہ اور جیو آتما کو الگ سمجھتے ہیں۔ وہ مرتیو کو پراپت نہیں ہوتے۔ جو انسان اپنے نیک افعال سے جیون مکت ہو جائینگے۔ وہ آخر مکتی حاصل کرینگے۔ اور تمام دکھوں سے آزاد ہو کر آنند۔ سرور مطلق حاصل کرینگے۔ پس اگیان یعنی جہالت ہی بندھ یعنی قید کا کارن ہے ؛

اگیان دور ہوگا گیان سے۔ آپ جب رات کو کمرے میں جاتے ہیں۔ تو چراغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اندھیر کی ضد روشنی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہر چیز کو اسکی ضد توڑتی ہے۔ دیکھ لیجئے۔ جیو آتما ست سروپ اور چت سروپ ہے۔ موکش میں ست چت آنند سروپ ہوتا ہے۔ اس دشا کو پیدا کرنے کیلئے انسان کو ضروریات کو کم کرنا چاہیئے۔ ضروریات کا بڑھانا دکھ کا بڑھانا ہے۔ جو انسان ضروریات کو کم کرتے ہیں۔ وہی حصول موکش میں جلد کامیاب ہوتے ہیں ؛

کہتے ہیں۔ ایک چار چار آنہ روز کماتا تھا لیکن بال بچوں کیساتھ اسی سے گذارہ کرتے آنند تھا کسی نے اسکے گھر میں ۲۰ روپے ڈالدیئے۔ اسے اب فکر ہوئی۔ کہ ۴ کی بجائے ۸ کماتے

جائیں۔ اتنی بات میں سرگرداں رہنے لگا جب کوئی پوچھتا کہتا سر میں درد ہے۔ آخر ایک دن ان روپوں کا مانگ آگیا۔ اور روپے طلب کئے بیچارے نے روپیہ واپس کر کے ہاتھ جوڑے اور کہا لے جاؤ اس بلا کو میری تمام مصیبت کا یہی باعث ہیں ؛

عالم ارواح کے نظارے

(از میجر جنرل سر الفریڈ ٹرنر کے۔سی۔بی)

میرا سب سے پہلا مشاہدہ

میرا اوائل عمر سے ہی یہ دشواش تھا۔ کہ ہمارے درمیان عالم بالا کی ارواح رہتی ہیں میری عمر قریب دس برس کے تھی۔ جب ایکدن علی الصبح میں اپنے ایک دوست کیساتھ دریائے مڈوے پر مچھلیاں پکڑنے کیلئے گھر سے چوری بھاگ نکلا۔ کنارہ بڑا ڈھلوان تھا۔ اور جہاں میں کانٹا ڈالے بیٹھا تھا۔ وہاں پانی بہت گہرا تھا۔ جونہی میں ذرا آگے بڑھا۔ دھڑام سے پانی میں گر پڑا۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا اسکی یاد میرے دماغ میں ابتک ویسی ہے۔ جیسے کہ یہ ابھی کل کا واقع ہے۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارے۔ کہ سانس لوں۔ اور کس طرح بچ سکوں۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ میں کنارے کی دوسری طرف تیرتا ہوا نہیں بلکہ بہتا ہوا جا رہا ہوں۔ جسکے آگے ایک عجیب ملک ہے جس میں نہایت خوشنما پھولوں اور نغمہ زن پرندوں سے پُر باغ ہیں۔ اور کنارہ پر تین اشکال سفید چادروں میں لپٹی ہوئی ایسی ہمدردانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی ہیں جنہیں میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں نے خیال کیا کہ میں نے اپنا بازو ان کی طرف پھیلایا۔ لیکن انہوں نے اسکی پرواہ نہیں کی صرف یہی لے میرے کان میں کہا۔ "ابھی نہیں ابھی نہیں!!" پس اسکے بعد میں بیہوش ہو گیا۔ اور جب میری بھولی بھٹکی آتما پھر اس تختہ عالم پر آئی۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ مجھے بیہوش پانی سے نکالا گیا تھا۔ اور بمشکل ہوش میں لایا گیا تھا اسکے بعد بھی میں نے کئی دفعہ انہیں تینوں اشکال کو خواب میں دیکھا ہے۔ اور کئی دفعہ میں نے خیال ہے۔ کہ یہ بہت جلد نہیں ہے۔ کہ میں اب انسے جا ملوں۔ مگر ہم سب کا وقت اور کام مقرر ہے۔ اسلئے ہمیں ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے مجھے یقین ہے کہ جب میرا وقت آئیگا۔ یہ تینوں ارواح یا فرشتے مجھے اس دنیا سے اٹھا لیجانے آئینگے اور اسوقت یہ آواز دہرائی نہیں جائیگی۔ کہ ابھی نہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں۔ کہ کئی اشخاص میرے اس بیان کو محض وہمی اور زندگی کی کشمکش میں میرے دماغ میں خلل آجانے کے باعث ایسے

کو ہمات ُامٹھ رہے ہیں۔ لیکن میرا یقین ہی اس سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد مجھے اسکے علاوہ کئی دیگر ارواح سے واسطہ پڑا ہے ؛

ناواقف ارواح سے ملاقات

اسکے کئی سال بعد میں نے ارواح کو بلانے کی ایک پرائیویٹ مکان میں جہاں دھوکا اور فریب کا ہر ممکن ذریعہ مسدود کر دیا گیا تھا مجلس کے کمرے میں کچھ کچھ روشنی تھی۔ لیکن مؤکل اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ اتنے میں کوٹھڑی میں سے کئی مادی اشکال نکلنی شروع ہوئیں۔ اور دائرے کے گرد آپس میں باتیں کرتی ہوئی گھومنے لگیں۔ یہ سب ارواح میرے لئے اجنبی تھیں۔ میرا ان سے اس سے پیشتر کبھی تعلق نہ ہوا تھا۔ اس دن سے میں عالم ارواح کی تحقیقات پر سرگرم ہو گیا۔ اور کوئی لحہ ضائع نہیں جانے دیا۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر میں بیشمار مجلسیں کیں۔ پہلے پہل صرف مادی اشکال ہی ظاہر ہوتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اعلےٰ درجہ کی آنی شروع ہو گئیں۔ کئی دفعہ بد ارواح بھی آئیں۔ لیکن فوراً غائب ہو گئیں۔ کیونکہ اعلےٰ ارواح کی موجودگی کے اثرات کو وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک دن بد ارواح نے تو ایسی خرابی کی۔ کہ ہمیں اپنی مجلس بند کر دینی پڑی۔ گو یہ روح ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن نہایت بدمزگی سے وہ ہمیں اپنی موجودگی کا زبردست علم کراتی تھی۔ اسنے ایک لیڈی کو اسکی کرسی کے پیچھے سے آ کر گردن سے پکڑ لیا۔ وہ لیڈی بہت چیخی چلائی۔ میں نے فوراً اسکی طرف روشنی کی۔ تب کہیں وہ اسکے پیچھے سے رہا ہوئی۔ لیکن اسقدر خوفزدہ ہوئی۔ کہ جھٹ کمرہ سے باہر چلی گئی۔ جب تک وہ واپس کمرے میں نہیں آئی۔ کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ لیکن جونہی وہ کمرے میں آئی۔ تو چند منٹ میں مؤکل کو جو ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نے کرسی سمیت اٹھا کر زمین پر پھینکدیا۔ میں نے فوراً اس طرف روشنی ڈالی۔ اور دیکھا کہ وہ بیہوش پڑا ہے لیکن کرسی سے نہیں گرا۔ اور زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ اسکے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی ؛

میرا ناخوشگوار تجربہ

مسٹر بسنٹ جو اسوقت وہاں موجود تھے۔ انہوں نے لہٰذا ایسی حالت میں ہمیں یہاں اور نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ میری زندگی میں مندرجہ ذیل واقعہ سے بڑھکر کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔ ایک رات سوتے سوتے میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے دیکھا کہ میرے کمرے میں دھندلی سی روشنی ہو رہی ہے۔ اور میرے سر پر سیاہی میں لپٹی ہوئی ایک شکل کھڑی ہے۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ اور مارے خوف کے ہلنا محال ہو گیا۔ وہ شکل میری طرف دیکھتی رہی اور آہستہ آہستہ

غائب ہوگئی پہلے میں نے خیال کیا۔ کہ شاید میں مناسب حدود سے باہر ہوگیا ہوں۔ لیکن جلد ہی میری حالت درست ہوگئی۔ میں آسیب کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکا۔ ابھی کچھ تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ کہ میرے گھر میں ایک ماتم ہوا تھا۔ چند راتوں کے بعد اس مرحوم یعنی میری کی کی روح میرے پلنگ کے پاس ظاہر ہوئی۔ اور جھٹ ہم میں ایک قسم کا خاص روحانی پردہ حائل ہوگیا میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے ہٹانا چاہا۔ لیکن وہ میرے ہاتھ میں نہ آسکا۔ مگر تمام اشکال گم ہوگئیں؛

ایک سفید ریش محافظ

ایک اور رات وہ مجھ پر ظاہر ہوئی۔ لیکن اس دفعہ اسکے ساتھ ایک درویش صورت۔ سفید ریش محافظ تھا۔ جو میرے پلنگ کے پاس کھڑا تھا تاکہ بد اثرات کو ہم سے دور رکھے اسکے بعد پھر ایک رات یکایک جو میری آنکھ کھلی۔ تو میں نے دیکھا۔ کہ میرے کمرے میں خوب روشنی ہورہی ہے۔ اور وہی روح پہلے کی طرح سفید لباس میں ملبوس مگر روز روشن کیطرح چمکتی ہوئی پھر ظاہر ہوئی۔ اور اسنے میری طرف کئی بار اشارہ کیا۔ اور پھر غائب ہوگئیں میں نے اسے کئی دفعہ مجلسوں میں دیکھا ہے۔ لیکن اکیلے کے پاس وہ کبھی نہیں آئی۔ وہ پھولوں کی بڑی مشتاق تھی اسلئے میں ہر مجلس میں اسکے لئے پھولوں کی ایک ٹوکری لایا کرتا تھا۔ وہ اس ٹوکری کو ہمیشہ اپنے ساتھ لے جاتی۔ لیکن ایک دن وہ ٹوکری چھوڑ گئی۔ اور اُسنے مجھے تبلایا۔ کہ اب وہ ایک اعلےٰ طبقہ میں پہنچ گئی ہے۔ جہاں کہ دنیاوی اشیاء نہیں لے جاسکتیں؛

میں نے اپنے ہاتھوں میں جو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ اُنہیں لیکر بہت خوش ہوتی تھی۔ کیونکہ در اصل یہ اسی کی تھیں۔ وہ ہر مجلس کے شروع میں لے لیتی۔ اور اسکے اختتام پر واپس دیجاتی۔ ایکدفعہ اسنے یہ انگوٹھیاں واپس نہ کیں۔ اسپر تلاش شروع ہوئی۔ لیکن کہیں نہ ملیں۔ میرے دوست کہنے لگے۔ کہ ہمیشہ کیلئے کھوگئیں لیکن میں ان سے بہتر جانتا تھا۔ جب قریب پندرہ روز کے بعد دوسری مجلس ہوئی۔ تو وہ اُنہیں واپس لائی۔ اور خود میری انگلیوں میں پہنا گئی۔ ان معمولی واقعات سے بخوبی پتہ لگتا ہے۔ کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہے میں نے کئی دفعہ دیکھا۔ کئی مقفل کمروں میں سے مجلس کے کمرہ میں پھول وغیرہ لائے گئے ہیں۔ اور حاضرین کو تقسیم کئے گئے ہیں؛

حیات [illegible]

(یورپین سائنس دانوں کی نظر میں)

اس دُنیا میں دو قسم کے خیالات کے انسان آباد ہیں۔ ایک فریق موت کے بعد زندگی

کا قائل ہے۔ اور دوسرا نہیں۔ مگر کثیر التعداد لوگ اس دلچسپ مسئلے پر مطلق غور ہی نہیں کرتے۔ ایک مزدور تمام دن جلتی دھوپ میں زمین کھودتا ہے۔ ایک بابو دس گھنٹے متواتر میز کے سامنے بیٹھا اپنی قلم سے کام لیتا ہے۔ ایک کاریگر لگاتار آٹھ گھنٹے مشینوں کی گڑگڑاہٹ کے درمیان کھڑا رہ کر اپنے اوزاروں سے چھوٹے چھوٹے پرزے بناتا ہے۔ بھلا ان سب کو فرصت کہاں۔ کہ ایسے نازک سوال کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ تاہم سر آلیور لاج مشہور سائینسداں کا قیاس ہے کوئی انسانی دماغ ایسا نہیں جس میں حیات ابدی کا خیال کا خیال کبھی نہ کبھی حد تک جاگزیں نہ ہوئے چنانچہ سر آلیور کا اپنا اعتقاد ہے کہ جسمانی موت کے بعد انسانی دماغ اپنی اصلی صورت میں زندہ رہتا ہے۔ بلکہ آپ مانتے ہیں۔ کہ جو اشخاص دوران زندگی میں حیات ابدی کے قائل ہیں وہ اپنے مخالف فریق کی نسبت زیادہ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اُسکے ساتھ ہی زیادہ روپیہ کماتے ہیں۔ چند سال ہوئے دمدار ستارہ ہماری زمین کے اسقدر قریب آگیا تھا۔ کہ اسکی ٹکر سے زمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بھلا ہر ایک سائینسدان کا جس نے اُن دنوں میں یہ ثابت کر دکھایا۔ کہ ستارے کی دُم اتنی بڑی نہیں۔ جسکی ٹکر سے زمین کو نقصان پہنچ سکے۔ ضروری تھا۔ اس خوشخبری سے عوام الناس کی دہشت کم ہوئی۔ مگر بدقسمتی سے دوسرے ہی دن ایک اور حضرت بول اُٹھے۔ کہ دُم کی کمزوری یا زور کا سوال نہیں۔ بلکہ ستارے کی زہریلی گیس زمین کے بالکل نزدیک آجانے سے ضرور زمین پر پھیل سکتی ہے جس سے ہم سب دم گھٹ کر مر جائیں۔ تو غیر ممکن نہیں۔ اب آپ یاد کیجئے۔ کہ ان دنوں میں آپ سب کے دلوں پر کیا گذرتی تھی۔ اور اگر یہی خیال بڑھ جاتا۔ تو کیا ہوتا۔ فرض کرو۔ کوئی سائینسداں اپنی زبردست دلائل سے ہمیں یقین دلا دیتا۔ اور ہم مان لیتے۔ کہ قیامت قریب ہے۔ تو ہمارا حال کیا ہوتا؟ ہم اپنے خیال سے اپنا آخری وقت کیسے کاٹتے؟ حیات ابدی کی قدر و قیمت ایسے وقت پر معلوم ہو سکتی ہے۔ کھاؤ پیو اور آنند کرو۔ کیونکہ کل مر جانا ہے۔ اس کہاوت کو سچ ماننے والے مرتے دم تک عیش کر سکتے ہیں جنکے لئے یہی زندگی سب کچھ ہے۔ وہ یا تو قیامت کے ڈر سے ہی خود بخود فنا کی گود میں جا بیٹھتے ہیں۔ یا کوئی ہمت والے مرد شانتی سے انجام کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر جو فنا کا قائل ہی نہیں۔ اور سچے دل سے حیات ابدی کو مانتا ہے۔ اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ اور وہ آخری دم تک اپنے فرائض سے غافل نہیں ہو سکتا۔

ابدیت کا تعلق زندہ دلی سے

سر آلیور ایک درزی کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جو روزگار کی تلاش میں آوارہ وطن ہو کر

ایک ایسے گاؤں میں جا بسا۔ جہاں اُسوقت تک کسی درزی کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے لاکھ سمجھایا۔ اور نظیریں پیش کیں۔ کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ نقصان اُٹھاؤگے کیونکہ ہمارا گاؤں درزی سے کام کرانا نہیں جانتا۔ مگر اُس مرد خدا نے ایک نہ مانی۔ اور برابر اپنے کاروبار کو جاری رکھا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال میں گاؤں کا سارا کام اسے ملنے لگا۔ اور وہ کئی سال تک نہایت کامیاب زندگی بسر کرکے فوت ہوگیا۔

اُسکے بعد چند اور درزیوں نے اُسی جگہ کام سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے اسکی وجہ کیا تھی؟ صرف یہ کہ کامیاب درزی تہ دل سے حیات ابدی کا معتقد تھا۔ اور اسی وجہ سے ہروقت خوش رہتا تھا۔ اُسکی خوش طبعی زندہ دلی اور حسن اخلاق آخر کار اُسے کامیابی کے زینے تک پہنچا کر رہے۔ مگر اور سب فیل ہوگئے۔ یہ صفات موروثی ہوسکتی ہیں۔ یا دھرم پستکوں کے پڑھنے سے اور کچھ گیان حاصل کرنے سے انسان اس منزل کو پہنچ سکتا ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی سب سے ضروری امر حیاتِ ابدی کا اعتقاد ہے جسکے بغیر زندہ دلی اور خوشحالی کی توقع رکھنی مشکل ہے۔ جو اشخاص موت کے بعد زندگی کے قائل ہیں۔ نہ صرف قائل بلکہ اسپر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اور اسے اپنا دین وایمان سمجھتے ہیں۔ وہ سچے آستک بن سکتے ہیں۔ موت اُن کے جتنی قریب آتی ہے۔ اُتنے ہی وہ خوش ہوتے ہیں۔ بلکہ اُنکا دل ودماغ دوسری دنیا میں داخل ہونے سے پیشتر سرگرمی اور شوق میں اتنا مست ہوتا ہے جیسے کہ کوئی مدت کا بچھڑا ہوا پردیسی اپنے وطن کے قریب پہنچکر انتہا درجہ کی خوشی محسوس کرتا ہے۔

ہر حال میں خوش رہنے کا طریقہ

مگر یہ راہ بڑی کٹھن ہے۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے ہر کوئی یہانتک پہنچ نہیں ویسے تو سب کہتے ہیں۔ کہ موت کے بعد زندگی ممکن ہے۔ مگر بہت تھوڑے ہیں۔ جو اس سچے اصول پر تہ دل سے کاربند ہوکر آخر کامیابی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ اس منزل تک پہنچنے سے پہلے ہر حال میں خوش رہنے کی تعلیم حاصل کرنی لازمی ہے۔ اور جو اس رمز کو سمجھ چکے ہیں۔ وہ دونوں دُنیاؤں میں کامیاب ملنے گئے ہیں۔

خوشی و رنج اور دُکھ وسُکھ حسب معمول انسانی طبیعتوں پر اپنا اپنا اثر ڈالکر کام کی مقدار کو بڑھا گھٹا سکتے ہیں۔ مگر جو شخص ان دو مختلف حالتوں میں یکساں رہتا ہے جسے یقین ہے۔ کہ یہ سب تبدیلیاں عارضی ہیں جس کا ایمان ہے کہ اگر میں اس زندگی میں مکمل نہ ہو سکا۔ تو کوئی حرج نہیں

دوسری زندگی میں دیکھا جائیگا۔ وہ نہ صرف دوسروں کی نسبت اپنے روزانہ فرائض بہترین طور پر سر انجام دے سکتا ہے۔ بلکہ اُسکا جسم اور دل و دماغ بھی ہمیشہ تروتازہ رہتا ہے۔ اُسکا چہرہ کبھی مغموم نظر نہیں آتا۔ اور وہ سچے معنوں میں انسان کہا سکتا ہے ؛

زمانہ حال کی تازہ مثال

یہ عقیدہ نہ صرف دُکان۔ دفتر یا میدان میں کام آتا ہے۔ بلکہ اسکی قدر و قیمت اُس وقت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ جب انسان کا مقابلہ اُن قدرتی عناصر سے ہو۔ جنکی طاقت کے آگے انسان کی کچھ ہستی نہیں۔ غالباً ناظرین قطب شمالی کی اُس مہم کو بھی نہ بھولے ہونگے جسکے لیڈر مرحوم کپتان سکاٹ تھے جنکا نام آج انگریزی قوم کا بچہ بچہ ادب اور عزت سے لیتا ہے۔ اگر آپ کپتان سکاٹ کی اس آخری چٹھی کو پڑھیں۔ جو مرنے سے غالباً چند منٹ پہلے اُسنے اپنی بیوی کے نام لکھی تو یقیناً اس فخر قوم انگریز کی دلاوری اور عقیدے کا نقش آپ کے دل پر کھنچ جائیگا جسکی کوئی اور نظیر آجکل ملنی مشکل ہے۔ کپتان سکاٹ نے لکھا تھا۔ قادر مطلق اب مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ تم اطمینان رکھنا۔ کہ میں پوری شانتی کیساتھ اس دُنیا کو چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے موت کا مطلق ڈر نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ اور میرا دل میرے قابو میں ہے ؛

مردوں سے بات چیت کرنیکا آلہ

دو ڈچ عالمان طبعیات ڈاکٹر مثلا اور ڈاکٹر زالبرگ نے اپنی نئی کتاب "اسرار مرگ" میں عجیب دعوےٰ کیا ہے۔ کہ ۲۲ سال سے وہ تجربات کر رہے تھے۔ کہ آیا اس سوال کا حل مل سکتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان زندہ رہتا ہے۔ علم طبعیات سے یہ دونوں ڈاکٹر اپنی علمی تحقیقات سے ہالینڈ میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مختلف قسم کے گیسوں کو متحد کرنے اور سیال ہوا میں بجلی کی لہریں داخل کرنے کے تجربات کئے ہیں۔ انہوں نے علم الارواح کی تحقیقات بالکل نئے طریقے سے کی ہے۔ انہوں نے کوئی معمول نہیں بنایا۔ انہوں نے اپنے خاندان کے آدمیوں پر تجربے کئے۔ اور آخر کار ایک آلہ تیار کیا۔ جسکے ذریعہ سے وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم اپنے خاندان کے مرے ہوئے آدمیوں سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ اس آلہ کا نام ڈنامسٹوگراف ہے۔ اس آلہ کے امکان کی نسبت پہلے ایک مفروضہ پیش کر دینی ضروری ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے۔ کہ مردہ آدمیوں کی روحیں زندہ رہتی ہیں لیکن وہ ہماری دُنیا پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتیں۔ اور یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ وہ بالکل دوسری قسم کی اثر رکھتے ہیں۔ اور ہم دوسری قسم کی لیکن فرض کرو۔ کہ ایک ہستی جو اس قسم کی معلوم ہو جائے۔ جو روحانی

اور مادی دونوں دنیاؤں میں کام دے سکے تو اسکے وسیلہ سے دونوں جہانوں کے باہمی نامہ و
پیام کا سلسلہ ہوسکتا ہے۔ جو شخص اس بھید کو دریافت کریگا۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا امداد
کنندہ سمجھا جائیگا۔ ڈاروِن اور ایڈیسن اسکے مقابلہ میں طفل مکتب خیال کئے جائینگے۔ پس اگر یہ
تھیوری ٹھیک ہے۔ تو اس آلہ کے کارآمد ہونے میں کچھ شک نہیں رہتا۔ دس سال تک انہیں
صرف پیغام ملتا رہا۔ کہ ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہمارے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔
لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے آلہ کو مکمل کیا۔ اور اب وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم تمام ارواح سے بخوبی بات
چیت کرسکتے ہیں۔

روحوں کا تار گھر

تقریباً اڑھائی گز لمبا اور سوا دو گز چوڑا ایک کمرہ جسکی بلندی ۳ گز ہے۔ بنایا گیا۔ اسکے
اندر داخلہ کا راستہ ایک دالان سے تھا۔ باقی سب دروازے اور کھڑکیوں پر جہاں لگا کر موٹے
موٹے سیاہ کاغذ جڑ دیئے گئے تھے۔ اس کمرے کا فرش خاص طور پر مستحکم کیا گیا تھا۔ تا کہ زمین سے
نکلنے والی حرارت کی لہریں آلات تک پہنچکر اپنا اثر نہ کرسکیں۔ جن دروازوں سے گذرگاہ کا راستہ
نکلتا ہے۔ اسمیں ایک کھڑکی ہے جس میں روشندان لگے ہوئے ہیں۔ تجربہ کرنیوالے دروازے کے
باہر گذرگاہ میں بیٹھے آلات کو چھوٹی کھڑکی سے دیکھتے رہے۔ الغرض دوران تجربہ میں کوئی آدمی
بھی اس کمرہ میں نہیں تھا۔ اثنائے پیغام رسانی میں بعض اوقات دیکھنے والوں کو ریکارڈ کے اختلافات
معلوم کرنے کے لئے دوربین کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔

اس کمرے میں سب سے اوّل ایک گتے کا سلنڈر رکھا گیا۔ جو تقریباً پچاس سینٹی میٹر اونچا
اور پچیس سینٹی میٹر چوڑا تھا۔ اسکی گنجائش ست بائیس میٹر تھی یعنی اس میں جسم انسانی کا تقریباً ⅔
حصہ سما سکتا تھا۔ اس سلنڈر کے دو پیٹین کی چادریں لگی ہوئی تھیں۔ جنپر مہریں ثبت تھیں۔
تاہم طاقت انسانی کے اخراج کیلئے دو گتے خالی چھوڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ ظاہر کرنیوالی روحانیت
کو اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ گویا کہ سلنڈر کا اندرونی حصہ یا متعلقہ ایک شیشہ اور ربڑ کی نلی سے
بالکل بند ہوتا تھا۔ یہ شیشہ اور ربڑ کی نلی سلنڈر کو ریکارڈنگ انسٹرومنٹ کیساتھ ملاتے ہیں۔
اور اسکا نام ہے مالومیٹر۔ اسی کی بناوٹ تھرمامیٹر کی بناوٹ سے کچھ ملتی جلتی ہے۔ الکوحل کا
ایک قطرہ پارہ کی جگہ ہوتا ہے کیونکہ الکوحل آسانی سے ہل سکتا ہے۔ اسلئے سلنڈر کے اندر ذرہ
سے یا آسانی سے جو دباؤ پہنچتا ہے۔ وہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکم دیتے ہیں کہ اس جگہ سے چلے جاؤ الکوحل
کا قطرہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے جبتک کہ انسانی طاقت کو پلیٹ میں داخل ہونیکا حکم دیا جاتا ہے

ویسا بار بار ہوا۔ اسکے بعد بڑے بڑے سلنڈر استعمال کئے گئے۔ اور آخر میں دو سلنڈروں سے کام لیا جائیگا جنمیں سے ایک انسانی طاقت : الایسینڈر دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اسطرح سے انسانی طاقت کا وزن اور ڈبل ڈول کا پورا پورا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جسم شے سلنڈر میں داخل ہو سکتی ہے لیکن سوال پیدا ہوگا۔ کہ کیا روحیں مادی جسم رکھتی ہیں۔ اسمیں کیا شک ہے۔ ڈاکٹر مشالا اور ڈاکٹر زبرگ کہتے ہیں۔ کہ دنیادی جسم سے جدا ہونے کے بعد جو کچھ باقی رہتا ہے۔ وہ خالص روح نہیں ہے۔ بلکہ ایک جسم اسکے ساتھ باقی رہتا ہے۔ جو معمولی ہوا کی مانند کثافت رکھتا ہے۔ تاہم ہوا سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے ؛

جسم لطیف کی کیا حالت ہوتی ہے

اس جسم لطیف کے سر اور گندھوں کی نشو ونما باقی حصوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اسکی ہستی بھی چنداں مسرت بخش نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ اپنے اعضاؤں سے کوئی کام نہیں لے سکتا۔ اور سایہ کی طرح ہوا میں آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اسکا جسم کثیف کیطرح ناش ہو جاتا ہے۔ اور اسطرح دوبارہ مرکر ہمیشہ کیلئے فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اصول چنداں اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہت سے ماہرین علم روحانیت اسی بات کے مدعی ہیں۔ کہ ملک عدم کے رہنے والے خوش اور شادماں رہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک روح ایری نے ایک لیڈی امریٹ سے ظاہر کیا کہ میں آنند اور شانتی سے زندگی بسر کرتی ہوں۔ یہ بات بھی قابل یقین ہے۔ یہ جسم لطیف دوبارہ مرنے کے بعد فنا ہونے کی بجائے ایک خاص منزل پر جا پہنچتا ہے۔ جسکو تیسرا سورگ کہہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اسیطرح کے سات سورگ ہیں۔ مشرقی علم روحانیت کے ماہر تھیوسوفسٹ ڈینٹی لاطینی شاعر اور سویڈن برگ کی تصانیف کمازکم اس یقین کو پختہ کر دیتی ہیں۔ کہ مرنے کے بعد انسانی جسم قائم رہتا ہے ؛

مرنے کے بعد جسم کا حجم کتنا ہوتا ہے

روحانیت کے فلاسفروں نے یہانتک کمال کیا ہے۔ کہ موت کے بعد جسم کے طول و عرض کو بھی ناپ ڈالا ہے۔ اور سیاحتی کے ہندسوں میں بتایا ہے۔ کہ اسکا حجم ۲ ۵ میٹر ہے۔ اپنی قوت ارادی سے یہ گھٹ بڑھ بھی سکتا ہے۔ کم سے کم اسکا حجم ۸ سینٹی میٹر ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ۲۶ ۵ سینٹی میٹر اسکا وزن ڈاکٹر ڈنگش میکڈ ڈنگا کی دریافت کے مطابق ۷ ۶ گرام ہے ؛

اس جسم کے متعلق مزید واقفیت

ڈاکٹروں نے ریک بہتی آلے کے ذریعے اس جسم کی تصاویر بھی کھینچی ہیں۔ اور ایک

گوشت - پوست یا مغز و استخوان کی کوئی علامت - لیکن جو مخلوق اسکے شکم سے برآمد ہوتی ہے ۔ وہ ان تمام اوصاف سے موصوف ہے ۔ اب بتائیے کہ یہ عجیب و غریب ظہور کہ فرع میں وہ باتیں موجود ہیں ۔ جو اصل میں نہیں کس چیز کا نتیجہ ہے ۔ یہ اس قوت کا نتیجہ ہے ۔ جو انڈے کے جسم میں مضمر ہے ۔ جو خود اگرچہ غیر متحرک و غیر محسوس ہے ۔ لیکن حرکت و احساس کا ایک بڑا ذخیرہ اسکے سپرد کیا گیا ہے ۔ یہ ترقی کا صرف ایک ذخیرہ ہے ۔ اب خود بچے کو لیجئے ۔ جسوقت وہ پیدا ہوتا ہے ۔ اسوقت (اگرچہ انڈے سے نسبتاً ممتاز حالت میں ہے) اُسکی بساط کتنی مختصر ہے ۔ اگر کسی نے بچوں کو اپنی آنکھوں سے مُرغ ہوتے نہ دیکھا ہوتا تو مشکل سے باور کر سکتا کہ یہی چھوٹا سا بچہ کسی دن مرغ ہو جائیگا - بچہ اس مختصر سی بساط پہ بڑھتے بڑھتے ایکدن مُرغ ہو جاتا ہے جسکی توانائی اور اُچھل - کود قابل حیرت ہوتی ہے ۔ لیکن مُرغ اس جسمی و توانائی پہ بھی آگے ترقی سے بالکل معذور ہے ۔ اگر ترقی کے تناسب کا لحاظ کیا جائے ۔ تو چاہئیے تھا ۔ کہ مُرغ کسی دن ہاتھی ہو جاتا ۔ لیکن وہ ہاتھی تو کیا ہوگا ۔ حالت موجودہ سے بھی دن بدن گرتا جاتا اور موت کے کنارے لگتا جاتا ہے ۔ یہ سب اسی قوت اندرونی کے کرشمے ہوتے تماشے ہیں ۔ جبتک خود رہی سارا اُبھار اور اُٹھان رہا ۔ جسدن سے اُسنے ساتھ چھوڑا سب ایک ایک کر کے مُنہ موڑ گئے ۔ گویا ۔ ؎

اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

خود انسان اس قاعدہ کی نہایت روشن مثال ہے ۔ انسان کے ہیکل کی حالت ایک کارخانہ سے مشابہ ہے جسطرح کارخانہ کا سارا دارومدار کل پُرزوں پر ہے ۔ اسیطرح ہیکل انسانی کی عمارت چند قوتوں پر کھڑی ہوتی ہے ۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ قوت کوئی چیز نہیں ہے ۔ یہی ہاتھ پیر - آنکھ - کان چند اعضا و جوارح اس عمارت کے اصلی ستون ہیں لیکن یہ محض وہم ہی وہم ہے ۔ غور سے دیکھئے تو ثابت ہوگا ۔ کہ اسکے اصلی کھمبے وہ بجلیاں ہیں ۔ جو ان خولدار ستونوں کے اندر بھری گئی ہیں ؛

اسمیں کوئی شک نہیں کہ آنکھیں ہی دیکھتی ہیں ۔ کان ہی سُنتے ہیں ۔ اور ہاتھ پیر ہی چل پھر میں مصروف رہتے ہیں ۔ لیکن کون نہیں جانتا ۔ کہ بصارت روز بروز گھٹتی جاتی ہے ۔ شنوائی میں دن بدن فرق آتا جاتا ہے ۔ اور ہاتھ پاؤں کی حالت دگرگوں ہوتی جاتی ہے ۔ حالانکہ ان اعضا کی جنسے یہ فرائض متعلق ہیں ہیئت ظاہری بدستور ہے ۔ اسکا باعث بجز اسکے کچھ نہیں ہو سکتا

کہ ان نلکیوں یا تاروں کے اندر کوئی بجلی پوشیدہ ہے ۔ جو انکو پردہ میں بیٹھی حرکت دیتی رہتی ہے
جبتک یہ بجلی زوروں میں ہوتی ہے ۔ سب کے سب تار پوری تیزی سے ملتے رہتے اور ٹھیک
ٹھیک کام دیتے رہتے ہیں ۔ اور جہاں اسمیں کچھ کمی آئی ۔ وہیں انکی رفتاریں بھی بدل گئیں ۔
اور ہیکل کے انتظام میں فرق آگیا ۔ اوپر کی مثالوں سے غالبًا یہ بات بخوبی ذہن نشین ہو جائیگی
کہ دراصل قوت ہی ہر شے کی اصل ۔ ہر شے کی ماہیت اور ہر شے کا جوہر بلکہ ہر شے کا اصل
مصداق ہے ۔ دیکھو انسان کے لاش سے قوت کے سوا اور کیا چیز کم ہوئی ہے ۔ صرف قوت '
اسکے تمام اعضاء گوشت ۔ پوست مغز و استخوان ابتک سب بدستور ہیں ۔ لیکن صرف قوت کے
نکل جانیکا یہ اثر ہے ۔ کہ لاش سے لفظ انسان کا اطلاق ہی جاتا رہا ۔ کیا لاش کی طرف اشارہ
کرکے حقیقتًا یوں کہہ سکتے ہیں ۔ کہ دیکھو یہ انسان پڑا ہے ۔ نہیں بلکہ یوں کہینگے کہ یہ انسان کی
لاش رکھی ہوئی ہے ۔ اور لیجئے آنکھوں سے جب قوت باصرہ جاتی رہی ۔ تو کیا وہ اصلی معنوں
میں آنکھیں ہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ اب وہ بے نور پتھر کے ٹکڑے رہ گئے ہیں ۔ یا ایسا آئینہ جو کسی
مصالحہ سے اندھا کر دیا گیا ہو ۔

بس یقینًا قوت ہی ہر شے کی اصل ہے ۔ اب ذرا کائنات پر غور کیجئے ۔ کہ آخر یہ کیا ہے
چند اشیاء کا مجموعہ ۔ جب کائنات چند اشیاء ہی کا مجموعہ ہے ۔ تو جسطرح ہر شے کی اصل
قوت ہے ۔ اسیطرح کائنات کی اصل بھی کوئی قوت ہی ہوگی ۔ گو ہر شے کی شخصی قوت اور
کائنات کی قوت میں کسیقدر فرق ضرور ہونا چاہیئے ۔ اور وہ فرق جو ان دونوں میں ہے ۔
بعینہ وہی فرق ہے ۔ جو خود ہر شے اور کائنات میں ہے ۔ یعنے ہر شے کی شخصی قوت فرد
واحد ہے ۔ اور قوت کائنات ان افراد کا ایک مجموعہ یا ان شاخوں کا ایک مخزن ہے ۔
اسی بناء پر ہم قوت کائنات کا نام آئندہ قوت کل یا حقیقۃ الحقائق لینگے ۔ (کیونکہ وہ تمام
شخصی قوتوں کا مجموعہ اور اس لحاظ سے کہ ہر قوت ایک حقیقت ہے ۔ تمام حقیقتوں کی حقیقت ہے)

اس تقدیر سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے ۔ کہ فضا البسیط کے طول و عرض میں جو کچھ ہمکو
محسوس ہو رہا ہے ۔ وہ اصلی کائنات نہیں ہے ۔ بلکہ اصلی کائنات اسکے اندر پوشیدہ ہے ۔ یعنے
قوت کل اور حقیقۃ الحقائق مع اپنی تمام افراد اور شاخوں کے ۔ اور یہ صرف اوپر کا خول ہے
جو ٹھیک اسیطرح لپیٹ لیا گیا ہے جسطرح انسان اپنے اوپر نقاب لپیٹ لیتا ہے ۔ یا مکڑی
اپنے پر جالا لپیٹ لیتی ہے ۔ اس قوت کو جب ہمنے اصل کائنات ٹھہرایا ۔ تو اب قابل فیصلہ

بحث یہ پیدا ہوتی ہے۔ کہ وہ واحد ہے یا کثیر۔ کیونکہ کائنات تو کثرت کا نام ہے۔ اس بحث میں صحیح یہ ہے کہ یہ قوت واحد بھی ہے۔ اور کثیر بھی۔ اسکو سورج کی مثال میں سمجھئے۔ سورج اپنی ذات سے واحد ہے۔ مگر ان کرنوں کے لحاظ سے جنکی کثرت نے یہ وحدت تیار کی یا صاف لفظوں میں جنکے مجموعہ ہی کا نام سورج ہے۔ کثیر ہے۔ اسیطرح یہ قوت بھی بلحاظ ذات واحد ہے۔ مگر اپنی ان بے تعداد شاخوں کے لحاظ سے جو موجودات کے ہر رگ و ریشہ میں دوڑی ہوئی ہیں۔ کثیر ہے۔ اور اس حیثیت سے وہ ایک کائنات اور عالم ہے۔ گویا وہ ہستی کا آفتاب ہے۔ جسکی شعاعوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ کسب حیات کر رہا ہے۔ ہر موجود میں اسکی ایک شعاع ہے۔ وہی شعاع اس موجود کی حیات ہے۔ اور اسی کا نام عرف میں قوت ہے۔ آنکھوں میں اسی کی ایک شعاع ڈالدی گئی ہے۔ جو اسے دیکھنے کا کام لیتی ہے۔ کانوں میں اسی کی ایک شعاع ہے۔ جو انکو سننے کے قابل بناتی ہے۔ نباتات کو اسی کی شعاعیں نشوونما کا ڈھنگ بتاتی ہیں۔ جمادات کو یہی شعاعیں حرکت کا سبق پڑھاتی ہیں۔ زمین میں یہی حرکت کا باعث ہیں۔ سورج کو انہیں سے ثبات و سکون ملتا ہے۔ ذروں میں انہیں کی چمک ہے۔ قطروں میں انہیں کا تموج ہے۔ زمین و آسمان۔ خشکی و تری غرضکہ کائنات ظاہر و خفی کا ایک ایک قطرہ۔ اور قطرہ کا ایک ایک حصہ انہیں شعاعوں کے بل پر قائم ہیں۔ اور کٹھ پتلیوں کے مانند انہیں کے اشاروں پر ادھر ادھر تماشے کھیلتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوجانا چاہیے کہ کائنات ظاہر جسکو ہم [illegible] اس قوت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ دریا [illegible] پانی کی [illegible] پانی سے [illegible] بہت سی نئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ جھاگ۔ بلبلہ۔ موج۔ گرداب۔ چادر۔ یہ چیزیں دیکھنے میں پانی سے الگ ہیں۔ اور انکے نام بھی الگ الگ ہیں۔ مگر کون نہیں جانتا کہ حقیقت میں سب پانی ہی پانی ہے۔ پانی نے مختلف شکلیں بنا کر دیکھنے والوں کو دھوکے میں ڈالدیا ہے۔ اور لیجئے۔ مکڑے کا جالا دیکھنے میں مکڑی سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ مگر غور کیجئے۔ تو یہ جالا آیا کہاں سے۔ اسی کے اندر سے۔ بس جالا مکڑی سے علیحدہ شے نہیں ہو سکتا۔ کائنات ظاہر بھی اس قوت کا ایک بھاگ ہے۔ جو بعد حرارت میں ہانڈی کی بھاپ کیطرح اوپر اٹھ آیا ہے۔ اور ابخرات ترین کے مانند جو جم جانے پر کثیف بادل بنجاتے ہیں۔ ایک محسوس اور منجمد گھیرا بنگیا ہے۔ یا ایک بلبلہ ہے یا موج ہے یا ایک گرداب ہے یا چادر ہے بہرحال یہ اسی کا ایک ظہور ہے۔ جو

پانی کے ان نفوس و اشکال کے مانند حادث اور بے حقیقت اور فانی امر ہے۔ اس ظہور خانی کے لحاظ سے اس قوت میں دو حیثیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے اسکے دو مختلف حکم ہو گئے ہیں۔ ایک اسکی خالص ذاتی حیثیت۔ دوسری اس ظہور کی حیثیت۔ ذاتی حیثیت سے وہ اصل۔ علت۔ نا قابل احساس۔ ازلی۔ دائم اور غیر فانی ہے۔ اس ظہور کی حیثیت سے۔ فرع۔ معلول محسوس حادث۔ زائل اور فانی ہے۔ ساتھ ہی جب یہ لحاظ کیا جاتا ہے۔ کہ قوت اور اسکا ظہور دونوں الگ الگ نہیں ہیں۔ ایک ہی چیز ہیں۔ جسطرح مکڑی اور مکڑی کا جالا یا پانی اور پانی کے مختلف اشکال۔ تو حیثیات مختلفہ کا اعتبار اٹھ کر صاف صاف یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ وہ خود ہی اصل ہے۔ اور خود ہی فرع۔ خود ہی محسوس ہے علت بھی ہے۔ اور معلول بھی۔ ازلی بھی ہے۔ اور حادث بھی۔ دائم بھی اور فانی بھی۔ مگر یاد رکھو کہ یہ اعتبارات مختلفہ مٹ نہیں سکتے۔ منجملہ کسی کے انگنت کرشموں کے یہ بھی ایک کرشمہ ہے۔ فانی اپنی جگہ پر فانی ہے۔ اور باقی اپنی جگہ پر باقی ہے۔ مکڑی کا جالا لاکھ صلیت میں مکڑی ہو۔ مگر پھر وہ جالا ہے۔ اور مکڑی مکڑی ہے۔ پانی کے بلبلے پانی سہی۔ مگر وہ دم میں سینکڑوں دفعہ بنتے اور بگڑتے۔ ابھرتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ لیکن پانی اپنی اسی شان سے مستانہ وار بہہ رہا ہے۔ بتاؤ کہ ان دونوں میں کون تمہارے جی لگانے کے قابل ہے۔ بلبلہ یا پانی۔ بلبلہ نہ تمہاری پیاس بجھا سکتا۔ نہ تمہاری نگاہ تماشبین کو سیر کرا سکتا۔ مگر پانی میں یہ سب کراماتیں موجود ہیں۔ ٹھیک اسیطرح کائنات ظاہر باطن ہی کا ایک ظہور اور عین باطن سہی۔ پھر بھی وہ بلبلہ کیطرح دم میں فنا ہو جانیوالا اور تیری روح کی سیری و رفع تشنگی کیلئے ناکافی ہے۔ پانی کے مانند وہ حقیقۃ الحقائق ہی لازوال اور تیرے جی لگانے کے قابل ہے۔ مگر آہ سے

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

تو اے انسان کاش تو جانتا کہ کائنات ظاہری ایک تھیٹر ہے۔ اور اسمیں جو کچھ تو دیکھ رہا ہے وہ سب رات کے وقت کے کھیل تماشے ہیں۔ جنکی میعاد صرف صبح تک ہے صبح ہوتے ہی یہ تھیٹر ایک عمارت سیمادی یا طلسمات سحر کی طرح بالکل معدوم ہو جائیگی۔ اور یہ سارے تماشے کافور دکھائی دینگے۔ کائنات درحقیقت مکڑی کا جالا۔ پانی کا جھاگ۔ پھوس کا شعلہ

اور ہانڈی کا اُبال ہے۔ ناداں اس کائنات کو پچھلے پہر کا خواب یا طوفان کے وقت کا حباب سمجھ۔ پھر اسکو بجلی کی کوندیا یا دخزانی کا رُخ جان۔ نادان۔ کائنات تیری عمر کیطرح گذر رہا ہے۔ اور تیز دھارے کی شکل میں بہا چلا جاتا ہے۔ وہ بادل کے سائے اور جنگل کے چھلاوے کے مانند ہے۔ وہ آنکھوں کی جھپک ہے۔ وہ ستارۂ سحری کی چمک ہے۔ فنا اسکی جڑوں کو کمزور کر چکی ہے۔ وہ اس دیوار کی مانند جسکو اندر سے دیمک چاٹ چکی ہے۔ عنقریب دھم سے گر پڑنے والا ہے۔ آہ تجھکو نہیں معلوم کہ قوت کل جسکے ارادہ پر یہ ڈھچر اب تک کھڑا ہوا ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ۔ اپنی صفت رکھتا ہے۔ آج وہ شان حجاب میں ہے۔ لیکن کل کیلئے شان بے حجابی اسکے منظور خاطر ہے۔ جسدن وہ شان بے حجابی میں جلوہ افروز ہوگا۔ کائنات ظاہر کا پردہ جو اسکے چہرہ کیلئے نقاب ہے۔ کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔ اسدن یہ پردہ پھٹ جائیگا۔ یہ عمارت مسمار ہو جائیگی۔ یہ جھاگ بیٹھ جائیگا۔ یہ ٹیلہ ٹوٹ کر بہ جائیگا۔ اس وقت نہ موج رہیگی۔ نہ گرداب۔ نہ چادر۔ نہ حباب۔ نہ بادل۔ نہ بجلی۔ نہ شعلہ۔ نہ اُبال۔ یہ سایہ جو چاروں طرف پھر رہا ہے۔ غائب ہو جائیگا۔ یہ دھارا جو زور شور سے بہ رہا ہے خاک میں ملجائیگا۔ جھپک بند ہو جائے۔ چمک ڈوب جائیگی۔ اسوقت نہ فرق و امتیاز رہ جائیگا۔ نہ جزئیات و اعتبارات باقی رہینگے۔ صرف ایک قوت رہ جائیگی جو قوت کل ہے۔ ایک حقیقت رہ جائیگی۔ جو حقیقت الحقائق ہے۔ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ۔ ناداں تلاش حقیقت کا مدعی تو محقق نہیں بوالہوس و بیعقل ہے۔ حقیقت کیواسطے جنگلوں میں مارا مارا اور پہاڑوں سے ٹکراتا پھرتا ہے۔ کیا آوارہ گردی ہی تلاش حقیقت ہے۔ یا سیر و تماشا تلاش حقیقت ہے۔ جنگل کی جڑی بوٹیوں یا پہاڑ کے دامن اور چوٹیوں میں کیا رکھا ہے۔ عناصر و سیارات اور زمین کے منابع و مغارات میں کیا ملیگا۔ ظاہر میں ظاہر ملیگا اور باطن میں باطن۔ تو ظلمت میں اور سطح میں ہے حق۔ اور سایہ میں اصل کا متلاشی ہے۔ ظلمت بیکار نہیں ہے۔ اسکو بھی دیکھ گمراہی میں نور کی تلاش حماقت ہے۔ سایہ بھی ایک چیز ہے سطح بھی ایک چیز ہے۔ ان سب [illegible] لطف دیکھ کر اسکے بعد اصل و عمق کے مقامات کی تلاش کر [illegible] [illegible] کی اجازت دیگئی ہے تاکہ تو سیر کرکے آئے [illegible] حقیقت [illegible]

[illegible] نہ [illegible] [illegible] [illegible]

اُسکی ایک ایک شاخ میں میں الگ الگ ہیں۔ ان سب کا مجموعہ تجھ میں موجود ہے۔ سچ

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دیکھ سورج کا نور بھی تجھ میں ہے۔ اور بجلی کی چمک دمک بھی۔ آگ کی حرارت تجھ میں۔ اور پانی کی برودت تجھ میں۔ تجھ میں ہوا کی لطافت بھی ہے۔ اور مٹی کا ثقل بھی۔ تو سبزوں کی طرح اُگتا پودوں کے مانند بڑھتا۔ پرندوں کے مانند اُڑتا اور جانوروں کیطرح کھاتا پیتا ہے۔ تو حملہ میں شیر اور فطرت میں لومڑی ہے۔ تو پہاڑ کی طرح سخت اور اٹل ہے۔ اور کینچلوں کے مانند نرم اور پچپلا۔ تو تیزی اور تکلیف رسانی میں کانٹا ہے۔ اور خوشرنگی اور راحت رسانی میں پھولوں کا حکم رکھتا ہے۔ جب تو نیکی پہ آجاتا ہے۔ تو قدر و حیرت میں فرشتہ ہو جاتا ہے۔ اور بدی کرتے وقت ابلیس معلم الملکوت کا بھی اُستاد ہے۔ غرض تو آگ بھی ہے۔ اور پانی بھی۔ خاک بھی ہے اور نور بھی۔ تجھکو پست و بلند دونوں کہتے ہیں۔ تو حق اور باطل دونوں خیال کیا جاتا ہے۔ اور تیرا ظرف اتنا وسیع ہے۔ کہ اسمیں ضد باتیں اکٹھا ہو سکتی ہیں۔ گویا تو خود ایک حقیقۃ الخلائق اور ایک مستقل کائنات ہے۔ اور کیوں نہ ایسا ہوتا آخر تو حقیقۃ الخلائق کا سایہ ہی تو ہے۔ سچ

نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

اور یہی وجہ ہے کہ عالم اکبر میں تیرا نام عالم اصغر رکھا گیا۔ اور بارگاہ حقیقۃ الخلائق سے حکومت عامہ کی سند تجھکو عطا کی گئی۔ پس تو باہر کہاں مارا پھرتا ہے۔ تو خود آئینہ حقیقت اور مرقع کائنات ہے۔ کائنات کے تمام ٹوٹے ہوئے آئینوں کو پھینک اور اپنے آئینہ میں نظر کر۔ یقین ہے کہ تیری آنکھوں میں سے جہالت کے تمام پردے اُٹھ جائینگے۔ اور وہ شاہد رعنا تجھکو بیحجاب نظر آئیگا۔ جو تیری رگ گردن سے زیادہ قریب تیرا مشتاق بیٹھا ہے۔ مگر آہ تیری جہالت نہ غفلت نے تجھکو دیوانہ بنا دیا ہے۔ تو ترقی کا بھوکا ہے۔ اور اسی کے فکر میں شب و روز سرگرداں پھرتا ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ آجتک تو یہ بھی نہ سمجھا کہ ترقی کیا چیز ہے اور اور اسکا صحیح مفہوم کیا ہے۔ نادان۔ آگاہ ہو کہ تیری ترقی زوال اور تیری بلندی پستی ہے۔ تو نے کانٹوں کے بستر کو پھولوں کی سیج جانا۔ اور زہر کے پیالہ کو جام شہد سمجھا۔ تجھے کون یقین دلائے کہ تیرا رستہ ناگفتہ ہے۔ تیرا ہیرا کانچ ہے۔ جسکو تو گوہر شب چراغ سمجھا ہے۔ وہ اندھیرے کا جگنو ہے۔ اور جس پہ تجھے صبح کا دھوکا ہے تھوڑی دور پہ چلکر کھل جائیگا کہ وہ کیا چاندنی تھی۔ تیرے ناقص التمیز ترقی کا مفہوم دو لفظوں میں یہ ہے۔ دولت۔ عزت۔ تیرے

تمام علم و عمل ۔ تمدن و تہذیب اور شبانہ روز کے جد و جہد کا مرجع آخر یہی دو چیزیں ہیں ۔ دولت و عزت ۔ لیکن تجھکو انکی حقیقت سے مطلق آگاہی نہیں ۔ ذرا عقل سے کام لے ۔ ایک بہت بڑے تونگر بادشاہ کو دیکھ ۔ جو تیری نام و نہاد دولت و عزت میں از سر تا پا بالکل غرق ہے ۔ اور غور کر کہ دولت و عزت کے بدولت اسمیں کیا اضافے ہوتے ہیں ۔ میرے خیال میں صرف دو اضافے ایک احتیاج ۔ کیونکہ وہ قدم قدم پر سینکڑوں ہزاروں احتیاجیں رکھتا ہے جنکی ذہنی بیڑیوں کی بدولت اسکی آزادی بالکل مرگئی ہے ۔ دوسرا مسخ وہ غریب دراصل انسان تھا ۔ لیکن چند بشکل انسان جانوروں نے اسکو پوجتے پوجتے ایک بلغم کا بت بنا دیا ہے اگر دولت و عزت نے اسمیں کوئی فضیلت پیدا کی ہو ۔ تو ظاہر کر ۔ نادان ۔ اس بیچارے مسخرے کو عزت و فضیلت سے کیا واسطہ ۔ فضیلت اور حقیقی ترقی ایک عارف کو حاصل ہے ۔ جو احتیاج کی تمام بیڑیوں کو کاٹ کر آزادی کامل کی ہوا میں پرواز کر رہا ہے ۔ اور جو اس ظاہری بے بضاعتی پر بھی تمام بنی نوع انسان حتےٰ کہ ان بلغمی تبخانوں کا بھی ملجا و مرجع ہے اسکی اصلی فضیلت حقیقت شناسی ہے ۔ کیونکہ وہ ارض و سما کے ان عمیق رازوں کا آگاہ ہے جنکی ایک سنک بھی زمین کے تمام خزانوں کے عوض میں مول نہیں مل سکتی ۔

نادان یہ ہے تیری ترقی کا ماحصل جسکو عاقل بجوئے نخرم کھکر لات مار مار دیگا ۔ ترقی چاہتا ہو تو خود شناسی پیدا کر ۔ خود شناسی ۔ آزادی حقیقت شناسی کا دروازہ ہے ۔ اور اصل میں آزادی اور حقیقت شناسی ہی کا دوسرا نام ترقی ہے ۔

سُن لے اور سمجھ لے ۔ کہ جسدن خود شناسی کا خلعت تجھکو دیا جائیگا ۔ اس دن سے تیری خواہشوں کے بندھن جنمیں تو مضبوط جکڑا ہوا ہے ۔ خود بخود ٹوٹتے اور گرتے چلے جائینگے ۔ اور جب یہ سب گر جائینگے ۔ تو اس پرند کیطرح جو پر کھولکر قفس سے نکالدیا گیا ہے ۔ تو بالکل آزاد کر دیا جائیگا ۔ وہی تیرے مقبول اور مقدس کئے جانے کا دن ہے ۔ اسوقت سے زمین و آسمان میں تیری پکار مچ جائیگی ۔ کائنات پر تیرا پورا قبضہ ہو جائیگا ۔ اور تو عالم حقیقت کا رہنے والا کہلائیگا ۔ اٹھ اٹھ اے طالب حقیقت اٹھ ۔ عالم حقیقت کا دروازہ تیرے لئے کھولا گیا ہے ۔

بڑھ بڑھ اے چلنے والے بڑھ کہ عالم حقیقت تیرا منتظر ہے ۔ دعا ہے کہ تیرا مسکن عالم قدوس ہو تیری خوابگاہ مقام صدق قرار پائے ۔ اڑ اور کنگرۂ عرش پر اپنا آشیانہ بنا ۔ اور ملکوتیوں میں اپنی جگہ لے ۔ اسوقت جس عالم میں تو ہے ۔ وہ پردیس ہے ۔ اور خبر نہیں کہ یہاں کیونکر پہنچ گیا ۔ مسافر تیرا دیس

اور وطن اصلی عالم حقیقت ہے۔ سے

تو بہار عالم دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی
کہ کشید دامن فطرت کہ بقید ما و من آمدی

انسانی زندگی کی بنیاد

(پنڈت شونا تھ شاستری ایم۔ اے کی قلم سے)

انسانی زندگی کی بنیاد کیا ہے؟ اس سوال کے متعلق کیونکر تحقیقات کی جائے۔ جسطرح ایک مکان کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور اس پر مکان قایم رہتا ہے۔ اسیطرح ہماری زندگی کی بھی بنیاد ہے؟ یہ زندگی کیا ہے۔ دُنیا کی اسٹیج پر ہم یہ کیا کھیل دیکھ رہے ہیں انسان کیا تماشا گاہ پر کھیلنے اور ناچنے والوں کی مانند کسی تاریک پردہ کے اندر سے ظاہر ہوا ہے اور کیا یہ ایک یا دو گھڑی کیلئے سُکھ اور دُکھ خوشی اور غمی۔ اُمید اور نا اُمیدی دیکھ کر تھوڑی دیر کیلئے ہنسکر اور رو کر پھر کیا کبھی اور تاریک پردہ کے اندر غائب ہو جائیگا؟ نہیں ہرگز نہیں صرف نہایت ہی چھوٹے دل والا اور دنیادی شخص اس قیمتی زندگی کو ایسی حقیر نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ ایکدفعہ انگلینڈ کا ایک بادشاہ بمعہ اپنے دوستوں کے شاہی محل کے ایک کمرہ میں لیٹا ہوا تھا۔ باہر گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اور نہایت سخت اندھیرا تھا۔ اُس اندھیرے میں سے اچانک ایک چاتک کھڑکی کے ذریعہ اُس گھر میں داخل ہوا۔ اور اُس کمرہ کے کارنس پر تھوڑی دیر تک بیٹھکر اور بول کر دوسری کھڑکی سے باہر نکل گیا۔ یہ دیکھکر بادشاہ نے کہا دیکھو انسانی زندگی بھی ایسی ہی ہے " اندھکار سے یہ پیدا ہوتی ہے۔ اور اندھکار میں ہی فنا ہو جائیگی "۔ کیا حقیقت میں انسانی زندگی ایسی ہے؟ گو ہم مثل سایہ کی تصویر کے عکس کی مانند ان تمام گھٹناؤں کو دیکھتے ہیں۔ لیکن انکی بنیاد کہاں ہے؟ اگر کسی شخص سے دریافت کیا جاوے۔ کہ بتلاؤ تو سہی۔ اس ملک میں انگریزی گورنمنٹ کی بنیاد کہاں ہے۔ یہ سوال سُنکر انسان کے اندر کس قسم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اوّل تو یہ سوال اسکے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کہ کس طاقت کے ذریعہ یہ انگریزی گورنمنٹ قایم ہے۔ دوسرے وہ سوچتا ہے کہ کس خاص مقصد کو پورا کرنے کیلئے اسکا وجود قایم ہے۔ کیونکہ ان دونوں باتوں پر ہی انگریزی گورنمنٹ کی بنیاد ہے۔ اسی طور پر یہ انسانی زندگی کی بنیاد کیا ہے۔ اس سوال کے حل کرنے کیلئے ہم لوگوں کو غور کرنا ہوگا۔

اوّل یہ زندگی کس طاقت کے سہارے قایم ہے۔ دوم کس مقصد کے پورا کرنے کیلئے اس لئے۔ گرم یا سرد۔ میٹھا۔ کڑوا جو
قیام ہے۔ زندگی کی تواریخ کے بارے میں سوچنے سے معلوم ہوتاہے۔ کہ یہ زندگی اپنی مرضی سواء کیا تمام سنسکار ہماری
کے سہارے قایم نہیں جس زندگی کیوجہ سے انسان یہ خیال کرتاہے کہ یہ جسم میرا ہے۔ یہ ز جاتاہے۔ وہی ہم دیکھتے ہیں
میری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ زندگی ہی میری اپنی جایداد نہیں۔ کونسے دن۔ کونسے لگن تاہے۔ اور کون دیتاہے۔ یعنی
کونسی گھڑی میں اور کس طریق سے یہ زندگی کا شرارہ اس جسم میں داخل ہوتاہے۔ اسبارے میں یا گیہ دلک کے ساتھ یک
مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ اور اسبارے میں میری مرضی کا کچھ بھی دخل نہیں۔ اور اسی طور پر سچ قایم ہیں جس شکتی کو ادلمبہ
جن تمام کاموں پر اس زندگی کی ہستی ہر ایک لحظہ انحصار کرتی ہے۔ اور جن تمام حالات کو بحرن کرتی ہے۔ انسانی زندگی
علیحدہ ہوجانے سے ایک گھڑی کے اندر اس زندگی کا خاتمہ ہوجاتاہے۔ ان تمام کریاؤں پر اب کیا ہمارا اس طور پر کہنا ٹھیک
کچھ اختیار نہیں۔ خون کی گردش کا کام۔ ہاضمہ کی طاقت کا کام۔ سانس لینے کا کام۔ یہ سب مجھ پر شش کو لیکر قایم ہے۔ اسی
مجھکو چھوڑکر اور میری مرضی کے بنا برابر لگاتار ہورہے ہیں۔ اسیواسطے اس زندگی کے اختیار ہے کہ یہ بہت معمولی بات ہے۔
بھی میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں اپنی مرضی سے اگر چاہوں تو خودکشی کرکے ایک لحظہ کے اندر اس۔ انہی کی اچھا کو پورا کرنے
زندگی کو ختم کرسکتا ہوں۔ لیکن ہزار مرضی ہونے پر بھی میں موت کو نہیں روک سکتا جس (؟) میں کیوں ہیں۔ چونکہ ا
کے کیا شروع۔ کیا درمیان اور کیا خاتمہ پر میرا کچھ ہاتھ نہیں۔ اسکو کسطرح سے اپنی جایداد کہو جو دا اپنی مرضی پورا کرنے
سکتا ہوں؟ اور کسطرح سے یہ خیال کرسکتا ہوں۔ کہ میری مرضی کے سہارے یہ زندگی قایم ہے نیوالا ہے۔ وہ اسی کی مرضی
اس زندگی کی پیدایش۔ رہایش اور اختتام جیسے میری مرضی کے ماتحت نہیں۔ اسی طور پر جن زندگی کے جو کرتا ہیں۔ انہی
وسایل کو لیکر یہ زندگی بنی ہے۔ اسپر بھی میرا ہاتھ نہیں۔ گیان (ذہن) بھاؤ (دل) اچھا (قوت ہوسکتاہے۔ کہ اس زندگی
ارادہ) ان تین طاقتوں سے یہ زندگی بنی ہے۔ اگر ان تینوں کو نکال دیا جاوے۔ تو اس زندگی کا کچھ بھی ہے کہ اس دُنیا کے کام
بھی باقی نہیں رہتا۔ لیکن اچھا بھاؤ پر قایم ہے۔ اور بھاؤ گیان پر قایم ہے۔ اور گیان حواسوں کے ل نہیں۔ اس سرشٹی میں
کے ذریعہ جو سنسکار حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان پر منحصر کرتاہے۔ ہم ان حواسوں کے ذریعہ کرتی ہے۔ بے ترتیبی کی
سنسکار حاصل کرتے ہیں۔ چتا شکتی جن تمام ادپادانوں کو لیکر سنجوگ اور بیوگ کے ذریعہ اس دنیا میں ایوولیوشن بتدریج
دُنیا کو قایم کرتی ہے۔ اور خواہشیں گیان کو آشرے کرکے پیدا ہوتی ہیں۔ اور بڑھتی ہیں سوائے اور کچھ نہیں۔ کہ
اور اچھا شکتی بھاؤں کی داسی ہوکر کام کرنا شروع کرتی ہے۔ اگر یہ روحانی ترکیب ٹھیک سب جگہ ترقی کا قانون د
ہو۔ تب یہ قبول کرنا ہوگا۔ کہ ان بیرونی حواسوں کے ذریعہ جو سنسکار ہم حاصل کرتے ہیں انسانی زندگی میں بھی یہ
وہی اس زندگی کے اصلی اور سب سے بڑے ذریعہ اور سب سے پہلی خوراک ہیں۔ لیکن تمام نہیں کہہ سکتے؟ اس زندگی
سنسکار جو ہم اندریوں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ کیا ان پر ہمارا ہاتھ ہے۔ تمام پیدا ہونے کے پانی میں ایک اینٹ

مالا پیدا ہوتی ہے۔ اور اس چھوٹے دایرے کے بعد نسبتاً ایک بڑا دایرہ
اس طرح پر دایرے کی شکل میں ایک ترنگ مالا کے بعد دوسری ترنگ مالا تمام
جگہ پھیل جاتی ہے۔ اسی طور پر غور کر کے دیکھو تو معلوم ہوگا۔ کہ انسانی روح بھی
اس دنیا میں جنم لے کر گیان۔ پریم وغیرہ کے روحانی دایروں میں بڑھتی جاتی ہے
اور اس طور پر انسان اعلےٰ زندگی کے لائق ہوتا جاتا ہے۔ اسی اعلےٰ حالت کے
لائق ہونا ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ انسانی زندگی کا برہم شکتی کے ذریعے
پرکاش ہوا ہے۔ اور ان کی مرضی پورا کرنے کے لئے مقرر ہے۔ ان دونوں صداقتوں
کا ثبوت جس درجہ ہم لوگ اپنے دل میں حاصل کریں گے۔ اسی درجہ ہم انسانی زندگی
کی بنیاد کے بارے میں سمجھنے کے لائق ہونگے۔ لیکن اس بنیاد پر مضبوطی سے کھڑا
ہونے کے لئے سادھن کی ضرورت ہے۔ ہماری اندرونی جسمانی۔ نفسانی خواہشیں
اور حیوانی جذبات اور بیرونی سینکڑوں قسم کی رکاوٹیں ان دونوں صداقتوں سے
ہم لوگوں کو دور لے جانا چاہتی ہیں۔ ایشور اشیرباد کریں۔ کہ ان دونوں صداقتوں
کو ہم لوگ مضبوطی کے ساتھ دھارن کر سکیں ؛

تمام شد

STATE CENTRAL LIBRARY HYDERABAD, A.P.